تالیف: حضرت آیت اللہ مکارم شیرازی

ترجمہ وتدوین: معارف اسلام پبلشرز

اصول عقائد

تألیف:

حضرت آیت اللہ مکارم شیرازی

ترجمہ وتدوین:

معارف اسلام پبلشرز

بسم الله الرحمن الرحیم

مکارم شیرازی، ناصر، ۱۳۰۵ -
اصول عقائد/ تالیف مکارم شیرازی؛ ترجمه و تدوین معارف اسلام پبلشرز. -قم: نور مطاف، ۱۴۲۲ق = ۱۳۸۰
۳۸۴ص
ISBN964-93104-6-0 ۱۰۰ اروپیہ
فهرست نویسی بر اساس اطلاعات فیپا
کتابنامه بصورت زیر نویس.
عنوان اصلی: پنجاه درس اصول عقاید.
۱. شیعه - عقاید ۲. شیعه اصول دین. الف. عنوان. ب. عنوان: معارف اسلام پبلشرز. ج. عنوان: پنجاه درس اصول عقاید. اردو.
۲۹۷/۴۱۷۲ BP۲۱۱/۵/م۷پ ۹۰۴۶
۱۳۸۰

مؤلف: آیۃ اللہ مکارم شیرازی
مترجم: معارف اسلام پبلشرز
ناشر: نور مطاف
تاریخ اشاعت: ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ۔ق
تعداد: ۲۰۰۰
اشاعت: اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

والصلوۃ والسلام علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ الطاھرین

ولعنۃ اللہ علی اعدائھم اجمعین

سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق او لم یکف بربك انہ علی کل شیء شھید (فصلت ۵۳)

تاریخ بشریت میں عقائد خصوصاً آغاز آفرینش اور قیامت کا مسئلہ انبیاؑ کی الٰہی دعوت کی بنیاد رہا ہے۔ ان الٰہی وآسمانی انسانوں کے کلام کا آغاز اور ان کے پیغام کا انجام انسانیت کو خدا تعالیٰ کی طرف دعوت دینا، لوگوں کی عالم آخرت کی طرف بازگشت اور قیامت کی طرف توجہ دلانا تھا۔

تاریخ کے طولانی سفر میں، زمانوں کے گذرنے میں اور شہروں کے پھیلاؤ میں جب کبھی بھی انسانی سماج نے اس اہم اور بنیادی اصول سے انحراف کیا یا اس کو کم اہمیت دی تو فتنے، بلائیں اور مشکلات اس کے دامن گیر ہو گئیں۔

ہمیں اس تلخ حقیقت پر باور کرنا چاہیئے کہ پیامبران الٰہیؑ کے سعادت بخش پیام اور مقدس راہ سے دشمنی اور مخالفت ہمیشہ سے رہی ہے جبکہ نور و نار میں، تقویٰ اور فسق و فجور میں اور ایمان و کفر میں جنگ و ستیز بھی مسلسل رہی ہے۔ اس سلسلے میں دین کے خلاف براہ راست جنگ کی صورت گزشتہ صدیوں اور قرون وسطیٰ میں خدائی دعویٰ سے لے کر خدا کے انکار تک جاری رہی ہے جبکہ عصر حاضر میں دین کے خلاف پس پردہ کی جانے والی معرکہ آرائی سیکولرازم، پلورلازم یا ہرمنوتک کی صورت میں ظاہر ہوئی اور دین کی حقیقت پر بے جا اور ناروا تاویلات و توجیہات کے انبار لگا دیئے گئے اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ادیان الٰہی کے ساتھ ساتھ انسانی مکاتب فکر یا دساتیر کو شنا بت پرستی یا ہندوازم وغیرہ کو بھی حق اور صراط مستقیم سمجھا جانے لگا۔

آج دنیا میں منظم و منسجم استعماری ادارے اور تنظیمیں جن کے پاس ارتباطات اور نشر و اشاعت کے انتہائی جدید وسائل موجود ہیں نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ ادارے معاشروں کے اعتقادات اور اقدار خصوصاً نوجوان نسل کی فکری بنیادوں پر شب خون مارتے ہوئے یلغار کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ چارۂ کار یہ ہے کہ اس وقت موجود امکانات و وسائل سے صحیح استفادہ کرتے ہوئے الٰہی اقدار و معارف کی ترویج و تشہیر کی ذمہ داری پوری کی جائے۔ اس عظیم ذمہ داری کا بار سنگین دل سوز، ربانی علماء اور علمی و تحقیقی مراکز پر ہے۔ البتہ خوش قسمتی سے ان اداروں کی ہر روز کی نشو و نما، ترقی اور ان کی پر ثمر کاوشوں کے نتائج کے ہم شاہد ہیں جو قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ کے مصداق ہیں "تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا"۔

کتاب "اصول عقائد" جیسی اہم کتاب پہ ایک سرسری نظر بتاتی ہے کہ اسکی تالیف و تدوین اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے یہ کتاب بنیادی دینی ابحاث کے لئے مفید اور نوجوان نسل کے بعض سوالات اور ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب تعریف و توصیف کی محتاج نہیں ہے تاہم کہا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے مؤلف حضرت آیت اللہ مکارم شیرازی ہیں جو مرجع تقلید ہیں اور یہ کہ گزشتہ تقریباً پچاس برس سے اعتقادی اور کلامی موضوعات پر تحقیق، تعلیم اور تدریس کے امور انجام دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے گہرے علمی مطالب اسکی سادہ و رواں ادبی تعبیرات کے رکاوٹ نہیں بنتے بلکہ قارئین کے لئے زیادہ جاذبیت و کشش کا باعث ہیں۔

پروردگار کی وحدانیت پر موجود "برہان نظم" کو بیان کرتے ہوئے جدید علمی مطالب کے ساتھ قرآنی آیات کو مرحط کیا گیا ہے جو پڑھنے والے کی معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔

اسلام کے نورانی معارف و حقائق کے مختلف قرآنی، کلامی، تربیتی، تاریخی اور معاشرتی پہلوؤں کی ترویج اور نشر و اشاعت میں معارف اسلامی پبلشرز اپنے تئیں سعی و کوشش میں مصروف عمل ہے۔ ہم بارگاہ رب العزت میں سپاس گزار ہیں کہ حضرت آیت اللہ مکارم شیرازی (دام ظلہ) کی خصوصی توجہ سے اس کتاب کے ترجمہ و ترتیب کی توفیق ہمیں حاصل ہوئی۔

ہم ان فاضل شخصیات کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کے ترجمہ، تصحیح اور ترتیب کے سلسلے ہماری کمک فرمائی۔ ہم تمام پرسوز اور فعال و متحرک علماء اور وہ علمی و تحقیقاتی مراکز جو شب و روز خالص محمدی اسلام کی ترویج و تشہیر میں سرگرم عمل ہیں ان کے لئے دعاگو ہیں کہ پروردگار متعال ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

معارف اسلام پبلشرز

فہرست

توحید کے دس سبق

عدل کے دس سبق

نبوت کے دس سبق

امامت کے دس سبق

معاد کے بارے میں دس سبق

توحید

پہلا سبق

خدا کی تلاش

خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے کیلئے ہم کیوں غور وفکر کرتے ہیں؟

۱) اس وسیع وعریض کائنات کے بارے میں جاننے اور اس سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق ہم سب کے دلوں میں ہوتا ہے۔

یقیناً ہم سب جاننا چاہتے ہیں کہ:

دلفریب ستاروں سے بھرا یہ بلند وبالا آسمان

دلکش مناظر سے بھری پڑی یہ وسیع زمین

یہ رنگ برنگی مخلوقات، خوبصورت پرندے، انواع واقسام کی مچھلیاں، دریا و پہاڑ، پیارے پیارے پھول، کلیاں اور آسمان کی طرف بڑھتے ہوئے مختلف درخت، کیا یہ سب خود بخود وجود میں آگئے ہیں؟

یا یہ عجیب وغریب نقش ونگار کسی ماہر وتوانا نقاش کے ذریعے کھینچے گئے ہیں؟

اسکے علاوہ ہم سب کے ذہنوں میں سب سے پہلے یہ سوالات بھی ابھرتے ہیں کہ: ہم

کہاں سے آئے ہیں؟

کہاں ہیں؟ اور کہاں جارہے ہیں؟

اگر ہمیں ان تینوں سوالات کے صحیح جواب حاصل ہوجائیں تو یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی یعنی ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ ہماری زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا؟ آخرکار ہم کہاں جائیں گے؟ اور اب (یعنی اس جہان میں) ہمارے کیا فرائض ہیں؟

ہماری روح کا جذبہ تجسس ہمیں کہتا ہے کہ: ان سوالات کے جواب تلاش کیئے بغیر چین وآرام سے نہیں بیٹھنا! مثال کے طور پر اگر کار کے کسی حادثے میں کوئی شخص زخمی اور بے ہوش ہوجائے اور اسے علاج ومعالجہ کیلئے ہسپتال لے جایا جاؤں گا تو جب بھی اسکی طبیعت کچھ بہتر ہوگی اور اسے ہوش آئے گا تو اسکا سب سے پہلا سوال اپنے اردگرد موجود لوگوں سے یہی ہوگا کہ: یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اور میں یہاں سے کب واپس جاؤنگا؟

اس مثال سے ظاہر ہے کہ انسان کے ذہن میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ انکا جواب حاصل کرنے کا خواہش مند رہتا ہے لھذا پہلی چیز جو ہمیں خدا کی تلاش اور کائنات کے پیدا کرنے والے کی معرفت حاصل کرنے کیلئے ابھارتی ہے وہ ہماری روح کی تشنگی اور جستجو کا جذبہ ہے۔

۲) شکر گزاری کا احساس۔ فرض کیجئے آپ کو ایک دعوت میں مدعو کیا جاتا ہے اور آپکی پذیرائی کیلئے شاندار اہتمام کیا جاتا ہے لیکن چونکہ آپ کو آپ کے بڑے بھائی کے توسط سے مدعو کیا گیا ہے لھذا آپ میزبان سے واقف نہیں ہیں اس شایان شان اور دل

پذیر محفل میں آنے کے بعد یقیناً آپ کی اولین خواہش یہی ہوگی کہ آپ اپنے میزبان سے واقفیت حاصل کریں تاکہ اسکا شکریہ ادا کرسکیں۔

ہم بھی جب اس وسیع وعریض کائنات پر نظر ڈالتے ہیں اور خالق کائنات کی عطا کردہ انواع واقسام کی نعمتوں کو دیکھتے ہیں مثلاً دیکھنے کیلئے آنکھیں، سننے کیلئے کان، سوچنے کیلئے عقل وشعور، مختلف قسم کی جسمانی وذہنی طاقتیں اور صلاحیتیں، زندگی کی بے شمار سہولتیں اور آسائشیں اور پاک وپاکیزہ روزی تو بے اختیار یہ خیال آتا ہے کہ ان تمام نعمتوں کے عطا کرنے والے کو پہچانیں کہ وہ کون ہے؟ اگر چہ اسے ہمارے شکریہ کی ضرورت نہیں مگر ہم چاہتے ہیں! کہ اسکا شکریہ ادا کریں اور جب تک ہم اس کام کو نہیں بجا لاتے ہمیں بے چینی کا احساس رہتا ہے اور یہی امر ایک واضح دلیل ہے کہ جو ہمیں خدا کی معرفت حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

۳) خدا کی معرفت سے ہمارے نفع ونقصان کا تعلق۔ فرض کیجئے آپ دوران سفر ایک ایسے چوراہے پر پہنچتے ہیں کہ جہاں پر بہت ہنگامہ اور فساد برپا ہے وہاں موجود تمام لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ اس چوراہے پر نہ رکیے، یہاں پر رکنا خطرناک ہے لیکن ہر گروہ آپ کو ایک الگ سمت جانے کا مشورہ دیتا ہے ایک گروہ کہتا ہے کہ: بہتر ہوگا آپ مشرقی راستے سے جائیں دوسرا مغربی راستے کو محفوظ راستہ بتاتا ہے جبکہ تیسرا گروہ ان دونوں کے درمیانی راستے کو محفوظ ترین راستہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ: خطرے سے بچنے اور پرامن مقام تک پہنچنے کا واحد ذریعہ کہ جہاں تمام اسباب سعادت مہیا ہوں یہی راستہ ہے۔

کیا ہم غور وفکر کئے بغیر کسی ایک راستے کا انتخاب کرلیں گے؟ کیا ہماری عقل اس بات کی

اجازت دے گی کہ ہم وہیں پر رک جائیں اور کسی بھی راستے کا انتخاب نہ کریں؟ یقیناً اسکا جواب نفی میں ہوگا۔

بلکہ ہماری عقل ہمیں اس بات پر آمادہ کرے گی کہ ہم فوراً حالات کا جائزہ لیں اور ہر گروہ کی بات غور سے سنیں۔ اور ان میں سے جس گروہ کی بات صحیح، صداقت پر مبنی اور قانع کرنے والی دلیل کے ساتھ ہو اس کو مان لیں اور پھر پورا اطمینان حاصل کرنے کے بعد ایک راستے کو انتخاب کرکے آگے بڑھ جائیں۔

اس دنیاوی زندگی میں بھی ہمیں ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مختلف مذاہب اور مکاتب فکر ہمیں اپنی طرف دعوت دیتے ہیں لیکن چونکہ ہمارا مستقبل، ہماری نیک بختی اور بدبختی اور ہماری ترقی اور ہماری پستی کا دارومدار بہترین اور صحیح راہ کے انتخاب کرنے پر ہے لھذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے بارے میں غور وفکر سے کام لیں اور ایک ایسی راہ کا انتخاب کریں جو ہماری ترقی اور تکامل کا باعث ہو اور ایسی راہ سے اجتناب کریں جو ہمارے لیئے بدبختی اور تنزلی کا سبب بن رہی ہو۔

یہ امر بھی ایک بہترین دلیل ہے جو ہمیں اس کائنات کے خالق کے بارے میں غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

خداوند متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ" (سورہ زمر آیہ ۱۸)

پس میرے بندوں کو بشارت دے دو (یہ) وہ لوگ ہیں جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) اب تک آپ نے خدا کی معرفت کے بارے میں جو کچھ اپنے والدین سے سنا ہے کیا اسکے علاوہ کبھی آپ نے خود بھی اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا ہے؟

۲) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خدا کی تلاش اور خدا کی معرفت میں کیا فرق ہے؟

۳) کیا آپ نے خدا سے راز و نیاز کے وقت ایک خاص قسم کا کیف اور روحانی لذت محسوس کی ہے؟

دوسرا سبق

ہماری روزمرّہ زندگی میں خدا کے وجود کی نشانیاں

۱) خدا کی معرفت اور علوم کی ترقی

فرض کیجئے آپ کا ایک دوست سفر سے واپس آتا ہے اور آپکے لئے ایک کتاب بطور تحفہ لاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کتاب نہایت اعلیٰ درجے کی تحریر ہے کیونکہ اسکا مصنف بہت بڑا عالم، صاحب مطالعہ، باریک بین، ماہر اور اپنے فن میں نابغہ اور کامل استاد ہے یقیناً آپ اس کتاب کا سرسری مطالعہ نہیں کریں گے بلکہ اس کی ہر ہر سطر یہاں تک کے اسکا ہر لفظ نہایت غور سے پڑھیں گے اور اگر اس کا کوئی لفظ یا جملہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو گھنٹوں بلکہ اگر موقع ملے تو کئی دن تک اس کے بارے میں غور و فکر کریں گے تا کہ اس کا معنی و مفہوم آپ کی سمجھ میں آجائے کیونکہ اس کتاب کا مصنف کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ ایک عظیم دانشور ہے کہ جس کا لکھا ہوا ایک جملہ بھی بے معنی نہیں ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس اگر کہا جائے کہ یہ کتاب اگر چہ بظاہر بہت پرکشش اور جاذب نظر آتی ہے لیکن اس کے مصنف کی علمی استعداد کم ہے اور وہ کوئی اعلیٰ علمی مقام نہیں رکھتا اور اسکی تصنیف میں بھی کوئی جان نہیں ہے! تو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ آپ کتاب پڑھتے

سرسری نظر ڈالیں گے اور جہاں پر بھی مفہوم واضح نہیں ہوگا اسے آپ مصنف کی کم علمی کا سبب قرار دیں گے اور اس کتاب کے مطالعہ کو وقت کا ضیاع قرار دیں گے۔ یہ کائنات بھی ایک بڑی کتاب کی طرح ہے اور اس کائنات کا ہر ہر موجود اس عظیم کتاب کے ایک کلمہ یا جملہ کو تشکیل دیتا ہے ایک خدا پرست انسان کے نقطہ نظر سے اس جہان کا ذرہ ذرہ ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ایک باایمان انسان خدا پرستی کے نور کی نورانیت میں تخلیق کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے خاص جستجو کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے (اور یہی چیز سائنس اور انسانی علوم کی ترقی میں مددگار ثابت ہوتی ہے) کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس مشیزی کا خالق لامتناہی علم وقدرت کا مالک ہے اور اس کے ہر ہر کام میں حکمت وفلسفہ مضمر ہے اسی لیے وہ بہت باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور نہایت گہرائی کیساتھ غور و فکر کرتا ہے! تا کہ قدرت کے اسرار و رموز کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے۔

لیکن ایک عام مادہ پرست انسان میں تخلیق کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کا جذبہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان چیزوں کا خالق "بے حس وحرکت مادہ" کو سمجھتا ہے اور اگر ہمیں سائنسی علوم کے انکشاف کرنے والے دانشوروں کی صف میں بعض مادہ پرست دکھائی دیتے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ غالباً وہ خدا کے تو قائل ہیں البتہ اس کا نام انہوں نے مادہ رکھ دیا ہے کیونکہ مادہ کے کاموں میں وہ نظم وضبط اور منصوبہ بندی کے قائل ہیں۔

مختصر یہ کہ خدا کی پرستش ہی علوم ودانش کی ترقی کا سبب بنتی ہے۔

۲) خدا کی معرفت، تلاش اور امید

جب انسان سخت مصیبتوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہوجاتا ہے اور رہائی کے سارے

راستے مسدود ہوجاتے ہیں اور ان مشکلات کے مقابلہ میں وہ اپنی ناتوانی اور بے بسی کا احساس کرتا ہے! تو ایسے مواقع پر صرف خدا پر ایمان اس کی مدد کرتا ہے اور اسے ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے قوت مہیا کرتا ہے۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ تو وہ خود کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی وہ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہوتے ہیں انھیں کبھی بھی بے بسی اور ناتوانی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا کی قدرت تمام مشکلات پر غالب ہے اور اس کی قدرت کے سامنے سب مشکلات آسان اور سہل ہوجاتی ہیں۔

خدا پر ایمان رکھنے والے اپنے پروردگار کی حمایت، لطف اور مہربانی کی امید کے ساتھ؛ مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی تمام طاقتوں کو بروئے کار لاکر اور خدا سے امید لگا کر اپنی کوشش کو جاری رکھتے ہیں جسکے نتیجے میں وہ مصائب اور سختیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

جی ہاں؛

خدا پر ایمان انسانوں کی سب سے بڑی تکیہ گاہ ہے۔

خدا پر ایمان استقامت اور ثابت قدمی کا سرمایہ ہوتا ہے۔

خدا پر ایمان دلوں کو ہمیشہ امید کے نور سے منور رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ باایمان افراد کبھی بھی خودکشی کے مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ خودکشی مایوسی وناامیدی اور شکست کی دلیل ہے! لیکن باایمان لوگ نہ تو ناامیدی کا شکار ہوتے ہیں اور نہ شکست کا احساس کرتے ہیں۔

۳) خدا کی معرفت اور ذمہ داری کا احساس

ہم بہت سے ایسے طبیبوں کو جانتے ہیں کہ جب ان کے پاس کوئی تنگ دست مریض آتا ہے تو نا صرف یہ کہ وہ اپنی فیس نہیں لیتے بلکہ اسکو دوا کیلئے پیسے بھی دیتے ہیں اور اگر مریض کی حالت نازک ہو تو اس کے چھوٹے سے مکان میں رات بھر اس کے سرہانے بھی بیٹھے رہتے ہیں، ایسے لوگ ہی خدا پرست اور باایمان ہوتے ہیں۔

لیکن ہم ایسے طبیبوں کو بھی جانتے ہیں کہ جو پیسے لئے بغیر بیمار پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کا ایمان پختہ نہیں ہوتا۔

باایمان انسان خواہ کسی بھی پیشہ سے منسلک ہو اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے وہ فرض شناس، نیک اور عفو و درگذر کرنے والا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اس کے جسم و جان میں ایک نگران موجود ہے کہ جو ہر وقت اس کے کاموں کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس بے ایمان افراد خود پسند، خود غرض اور خطرناک ہوتے ہیں اور وہ اپنے لئے کسی بھی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے، ظلم و ستم اور دوسروں کی حق تلفی کرنا ان کیلئے معمولی بات ہے اور وہ نیکی کے کام کرنے کیلئے بھی بہت ہی کم آمادہ ہوتے ہیں۔

۴) خدا کی معرفت اور سکون قلب

علم نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ موجودہ زمانے میں نفسیاتی بیماریاں اور ذہنی پریشانیاں پہلے کی نسبت بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

اور انکا کہنا ہے کہ ان بیماریوں کا ایک سبب تشویش اور پریشانی ہے یعنی مستقبل کی فکر،

موت کا خوف، جنگ کا ڈر، فقر اور شکست کی تشویش!

وہ کہتے ہیں کہ انسان کی روح کو ان تمام پریشانیوں اور فکروں سے "خدا پر ایمان" کے ذریعے محفوظ کیا جا سکتا ہے کیونکہ جب بھی پریشانیاں اور فاسد فکریں پیدا کرنے والے عوامل اسکی روح میں اثر انداز ہونا چاہیں تو "خدا پر ایمان" انہیں اثر انداز ہونے سے روک دیتا ہے۔

وہ خدا کہ جو مہربان ہے! وہ خدا کہ جو روزی عطا کرنے والا ہے! وہ خدا کہ جو اپنے بندوں کے حالات سے بخوبی آگاہ ہے اور جب بھی اس کے بندے اس سے لو لگاتے ہیں تو وہ انکو کبھی بھی مایوس نہیں کرتا اور انکو پریشانیوں سے نجات دلاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سچے مؤمن ہمیشہ سکون و اطمینان کا احساس کرتے ہیں اور انہیں کبھی کوئی ذہنی پریشانی لاحق نہیں ہوتی کیونکہ انکا ہر کام خدا کیلئے ہوتا ہے اور اگر انہیں کوئی نقصان بھی پہنچ جائے تو اسکی تلافی کیلئے بھی وہ اسی کا آسرا تلاش کرتے ہیں! یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی ان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری رہتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"الذین آمنوا و لم یلبسو ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن" (سورہ انعام آیہ ۸۲)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، سکون اور امن انہی کیلئے ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) آپکو کوئی ایسا تاریخی واقعہ یاد ہے کہ جس کے ذریعے مذکورہ ایمان افروز باتوں پر مزید روشنی ڈالی جاسکے؟

۲) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو خدا پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود غیر اخلاقی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں ان میں مذکورہ چار خصوصیات کیوں نہیں پائی جاتیں؟

تیسرا سبق

خدا کی معرفت کے لیے دو اطمینان بخش راستے

خدا کی معرفت کے موضوع پر قدیم زمانے سے آج تک متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور صاحبان علم وغیر علم کے درمیان، بہت سی گفتگو اور بحث ہوئی ہے۔

ہرایک نے اس حقیقت کو جاننے کیلئے مخصوص راستہ اختیار کیا ہے لیکن ان تمام راستوں میں سے بہترین راستے کہ جنکے ذریعے کائنات کے عظیم خالق کی معرفت جلدی حاصل کی جاسکتی ہے وہ دو ہیں:

۱: اندرونی راستہ (سب سے قریبی راستہ)

۲: بیرونی راستہ (سب سے واضح راستہ)

اندرونی راستے میں ہم اپنے وجود کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتے ہیں اور اپنی روح وجان کی گہرائیوں میں توحید کی آواز کو سنتے ہیں۔

اور بیرونی راستہ میں جب ہم اس وسیع وعریض کائنات کی مخلوقات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تمام موجودات کی پیشانی پر اور ہر ذرہ کے دل میں خدا کی نشانیوں کے جلوے نظر آتے ہیں۔

چونکہ ان دونوں راستوں سے متعلق گفتگو بہت طویل ہے لھذا ہم ایک مختصر بحث کے ذریعہ ان دونوں راستوں کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

الف: اندرونی راستہ

ہمیں چاہیے ان چند امور پر صحیح معنوں میں غور و فکر کریں:

۱) دانشوروں کا کہنا ہے کہ: جس انسان کے بارے میں توجہ کریں خواہ وہ کسی نسل یا کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو اگر اس کو اسکے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی مخصوص تعلیم نہ دی جائے یہاں تک کہ اس نے نہ تو خدا پرستوں کی بات سنی ہو اور نہ مادہ پرستوں کی؛ پھر بھی وہ خود بخود ایک توانا اور صاحب قدرت طاقت کا احساس کرے گا جو اس مادی دنیا سے بالاتر ہے اور ساری کائنات پر حاکم ہے۔

وہ اپنی جان و روح کی گہرائیوں اور قلب کے تمام گوشوں میں محسوس کرے گا کہ ایک لطیف و مہربان آواز جو نہایت واضح اور محکم بھی ہے اسے علم و قدرت کے ایک عظیم مبدا کی جانب کہ جسے ہم خدا کہتے ہیں بلا رہی ہے یہ اسی انسانی فطرت کی پاک و پاکیزہ آواز ہے۔

۲) ممکن ہے انسان مادی دنیا کی ہنگامہ آرائیوں اور زندگی کی چمک دمک میں اتنا مگن ہو جائے کہ وقتی طور پر اس آواز کو سننے سے غافل ہو جائے لیکن جس وقت وہ اپنے آپ کو مشکلات اور پریشانیوں میں گھرا ہوا پاتا ہے، جس وقت آفات ارضی و سماوی مثلا سیلاب، زلزلے اور طوفان یا جب خطرناک اور ناسازگار موسم میں اسکا ہوائی جہاز گھر جاتا ہے اور اضطرابی لحات اس پر حملہ آور ہوتے ہیں، ہاں ایسے وقت میں کہ جب

مشکلات پر قابو پانے کیلئے تمام مادی وسائل کے راستے بند ہو جاتے ہیں اور کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی تو اس وقت اسکی روح کی گہرائیوں میں یہ آواز ابھرتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے وجود کے اندر سے ایک خاص قسم کی قدرت اسے اپنی طرف بلا رہی ہے! ایک ایسی قدرت جو کہ تمام طاقتوں سے برتر ہے! ایک پوشیدہ طاقت کہ جسکے سامنے تمام مشکلات بہت آسان و سہل ہیں! آپ کو ایسے لوگ بہت ہی کم ملیں گے کہ جنھیں زندگی کے کٹھن وقت میں ایسی توجہ حاصل نہ ہو اور بے اختیار خدا کی یاد نہ آئے! یہ چیز اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہم اس کے اور وہ ہمارے کس قدر نزدیک ہے وہ تو ہماری جان و روح میں موجود ہے۔

فطرت کی یہ آواز انسانی روح میں ہمیشہ رہتی ہے البتہ ایسے لحات میں زیادہ شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

۳) تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایسے طاقتور افراد جو عام حالات اور عیش و آرام کے وقت خدا کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتے لیکن جب انکی طاقت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگتی ہیں اور موت سامنے منڈلانے لگتی ہے تو اس وقت عظیم خالق کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں اور فطرت کی آواز انہیں اچھی طرح سنائی دینے لگتی ہے!

تاریخ بتاتی ہے کہ جب فرعون نے اپنی کشتی حیات کو دریا کی بپھری ہوئی موجوں میں گھرا ہوا پایا اور دیکھا کہ وہی پانی جو اسکی زندگی اور اسکے زیر تسلط ملک کی آبادی کا سرمایہ اور اسکی مادی زندگی کی تمام طاقتوں کا سرچشمہ تھا اب اسکے سامنے موت کا پیام بن کر آیا ہے اور چھوٹی چھوٹی لہروں نے اسکو مجبور و لاچار کر دیا ہے اور ہر طرف سے نجات کی امید منقطع ہو چکی ہے تو اس نے با آواز بلند کہا ((اب میں اعتراف کرتا ہوں کہ [illegible]

خدا کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں)) دراصل یہ آواز انکی فطرت اور روح کے اندر سے ابھری تھی! نہ صرف فرعون بلکہ اس جیسے دوسرے لوگ بھی اس آواز کو سنتے ہیں۔

۴) آپ بھی جب اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس میں ایک ایسا نور چمک رہا ہے جو آپ کو خدا کی جانب بلا رہا ہے شاید آپ کی زندگی میں بارہا ایسے سخت اور مشکل مواقع آئے ہوں گے جب مشکلات سے نجات حاصل کرنے کیلئے تمام مادی وسائل کے راستے بند ہو گئے ہونگے! ان لمحات میں یقیناً آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہوگا کہ اس عالم ہستی میں ایک ایسی قادر مطلق طاقت موجود ہے جو ان مشکلات کو آسانی سے حل کر سکتی ہے۔

ایسے لمحات میں اس خالق کے عشق سے لبریز امید کی ایک کرن نظر آتی ہے جو مایوسی وناامیدی کے تیرہ وتاریک بادلوں کو آپ کے دل سے صاف کر دیتی ہے۔

جی ہاں! یہ نزدیک ترین راستہ ہے کہ ہر شخص اپنی روح کی گہرائیوں سے اس کائنات کے سب سے بڑے خالق تک پہنچ سکتا ہے۔

صرف ایک سوال: ممکن ہے کہ آپ میں سے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ آیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ہم نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے اور ماں باپ سے ہمیں جو تعلیم ملی ہے اسی کے زیر اثر حساس مواقع پر ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے اور خدا کے آگے دست حاجت دراز کرتے ہیں؟

آپ کو یہ سوال کرنے کا حق ہے مگر ہمارے پاس اسکا دلیل کے ساتھ اور دلچسپ جواب بھی موجود ہے جسے ہم آئندہ سبق میں پیش کریں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"فاذا رکبوا فی الفلک دعو الله مخلصین له الدین فلما نجاهم الی البر اذا هم یشرکون" (سورہ عنکبوت آیہ ۶۵)

پس جب وہ کشتی پر سوار ہوں (اور طوفانی موجوں سے موت کا ڈر پیدا ہو تو) اللہ کو اخلاص سے پکارتے ہیں پس جب اللہ انہیں (ساحل کی) خشکی کی طرف نجات دیتا ہے (تو) وہ (اسے بھول کر) شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) مندرجہ بالا آیت کو اسکے ترجمہ، آیت نمبر اور سورہ کے نام سمیت یاد کرنے کی کوشش کریں تا کہ بتدریج قرآن سے آشنائی حاصل ہو سکے۔

۲) کبھی آپ کی زندگی میں ایسا کوئی حادثہ رونما ہوا ہے کہ جب آپ کی امید ہر طرف سے منقطع ہو چکی ہو اور صرف خدا کے لطف و کرم کا آسرا باقی رہ گیا ہو؟

(ایک مختصر تقریر یا مضمون اس موضوع پر تیار کریں)۔

۳) اس راستے کو نزدیک ترین راستہ کیوں کہا گیا ہے؟

چوتھا سبق

ایک اہم سوال کا جواب

سوال:

گذشتہ اسباق میں ہماری گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ توحید اور خدا کی پرستش کی ایک آواز ہم ہمیشہ اپنے دل و روح کی گہرائیوں سے سنتے ہیں خاص طور پر مشکلات اور پریشانیوں کے وقت یہ آواز موثر اور قوی ہو جاتی ہے! ایسے مواقع پر ہمیں بے اختیار خدا کی یاد آتی ہے اور ہم اسکی لازوال طاقت اور ابدی لطف و کرم سے مدد مانگتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اندرونی آواز کہ جسے ہم ایک فطری آواز بھی کہہ سکتے ہیں ممکن ہے کہ یہ ہمیں اپنے معاشرے، اپنے اسکول کے ماحول اور اپنے ماں باپ کی تعلیم و تربیت کے اثرات کی وجہ سے سنائی دیتی ہو؟ اور ہمیں اس کی عادت پڑ گئی ہو؟

جواب:

اس شک و شبہہ کا جواب ہم ایک مختصری تمہید سے واضح کرتے ہیں

غیر پائیدار چیزیں ہیں اور ان میں تغیر وتبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں یعنی کوئی بھی عادت اور رسم ورواج جو کہ پوری انسانی تاریخ میں تمام اقوام کے درمیان ایک ہی شکل میں اور ایک ہی حالت میں باقی رہ گئی ہوں ہمیں نظر نہیں آتیں، اگر کہیں آج کوئی عادت یا رسم رائج ہے تو ممکن ہے کل اس میں تبدیلی پیدا ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ ایک قوم کی عادات و رسومات ممکن ہے دوسری اقوام میں نہ پائی جائیں۔

اسی بنا پر اگر ہم دیکھیں کہ کوئی رسم یا عادت بلا امتیاز ہر قوم وملت میں اور ہر دور میں رہی ہے تو وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ایسی چیزیں فطری اور انسان کی جان وروح میں مضبوطی سے پیوست ہیں مثلاً اولاد سے ماں کی محبت کسی نصیحت وتبلیغ یا عادت اور رسم کی بنا پر نہیں ہوتی کیونکہ کسی بھی قوم اور ملت میں کسی بھی زمانے میں یہ بات نہیں دیکھی گئی کہ کوئی ماں اپنی اولاد سے محبت نہ کرتی ہو اور اس پر مہربان نہ ہو!

البتہ اس بات کا امکان ہے کہ کسی نفسیاتی مرض کی وجہ سے ماں کی محبت زائل ہو جائے یا زمانہ جاہلیت میں غلط اور خرافات پر مبنی افکار کے زیر اثر بعض باپ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے لیکن ایسے حالات شاذ ونادر اور وقتی ہوتے ہیں جو بہت سرعت سے ختم ہو جاتے ہیں اور اپنی اصلی حالت یعنی اولاد سے محبت کی شکل میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

اس تمہید کی روشنی میں گذشتہ اور موجودہ زمانے کے انسانوں میں خدا کی پرستش کے مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں: (چونکہ یہ بحث کچھ پیچیدہ ہے لھذا زیادہ توجہ اور دقت کی ضرورت ہے)۔

۱) سماجی امور کے ماہرین اور نامور مورخین کی تصدیق کے مطابق ہم کسی بھی دور اور کسی بھی زمانے میں نہیں پائیں گے کہ انسانوں کے درمیان مذہب اور مذہبی رجحان کا

وجود نہ رہا ہو بلکہ ہر دور اور زمانے میں دنیا کے ہر گوشے میں کسی نہ کسی شکل میں مذہب کا وجود رہا ہے۔

یہ چیز بذات خود اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خدا کی پرستش کا تعلق انسان کی فطرت اور روح کیساتھ ہے نہ کہ نصیحت، رسم ورواج یا عادت کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر یہ محض رسم و رواج یا نصیحت وتبلیغ کا نتیجہ ہوتی تو اس قدر عام اور جاودانی شکل میں نظر نہ آتی۔

ہمارے پاس ایسے قرائن بھی موجود ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ قبل از تاریخ کے دور میں جو قومیں موجود تھیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں ایک مذہب کی پیرو تھیں (قبل از تاریخ کا دور اس زمانے کو کہتے ہیں کہ جب رسم الخط ایجاد نہیں ہوا تھا جسکی وجہ سے انسان اپنی یادگاروں کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا)۔

البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ چونکہ ابتدائی اقوام نے خدا کو ایک مافوق الفطرت ہستی کے طور پر نہیں پہچانا تھا اور فطری موجودات ومخلوقات میں اسکو تلاش کیا تھا لھذا خدا کی تخلیق کردہ مخلوقات میں سے ہی انہوں نے اپنے لئے کچھ بت بطور معبود بنالیے تھے۔ لیکن انسان نے اپنے ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ حق کو پہچاننا شروع کیا اور مادی چیزوں سے اپنے لیئے جو بت تراش لیئے تھے ان سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس جہان مادی سے ماوراء خداوند بزرگ وبرتر کی قدرت وطاقت سے آشنا ہوا۔

۲) کچھ بڑے نامور ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ آدمی کی روح میں دراصل چار قسم کی حس پائی جاتی ہے۔

۱) سمجھنے کی حس: جو انسان کو علم ودانش کے حصول کیلئے آمادہ کرتی ہے اور اس کی روح میں علم کی پیاس پیدا کرتی ہے خواہ اس علم میں مادی فائدہ ہو یا نہ ہو

۲) نیکی کی حس: کہ یہ انسان میں اخلاق وانسانیت کا سرچشمہ ہے۔

۳) ذوق لطیف کی حس: کہ جسکے ذریعے شعروادب اور فنون وجود میں آتے ہیں۔

۴) مذہبی حس: جو انسان کو خدا کی معرفت اور اسکے احکام کو انجام دینے کی دعوت دیتی ہے اور یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ مذہبی حسِ انسانی روح کی اصلی و بنیادی حس ہے یعنی نہ کبھی اس سے الگ تھی اور نہ کبھی الگ ہوگی۔

۳) آئندہ ابحاث میں ہم پڑھیں گے کہ خدا کے وجود کا انکار کرنے والے بہت سے مادہ پرست بھی خدا کے وجود کا کسی نہ کسی شکل میں اعتراف کرتے ہیں اگرچہ زبان سے اقرار نہیں کرتے لیکن اسے طبیعت یا دوسرے ناموں سے ضرور پکارتے ہیں اور طبیعت کیلئے ایسی صفات کے قائل ہوتے ہیں جو صفات خدا میں پائی جاتی ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ طبیعت نے انسان کو دو گردے اس لیئے دیئے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک گردہ کام کرنا بند کردے تو دوسرا گردہ زندگی کی مشینری کو جاری رکھے اور اسی طرح کی دیگر بہت سی باتیں......

لیکن کیا بے شعور طبیعت یا مادہ کے بس کی یہ بات ہوسکتی ہے؟ کیا یہ اسی خداوند کی طرف اشارہ نہیں کہ جسکا علم وقدرت لازوال ہے اگرچہ اسکا نام انہوں نے طبیعت رکھ دیا ہے۔

نتیجۂ بحث:

خدا سے عشق ہمیشہ سے ہماری روح میں تھا اور رہے گا۔

خدا پر ایمان ایک ایسا جاودانی شعلہ ہے جو ہمارے قلب و روح کو گرم رکھتا ہے۔

خدا کو پہچاننے کیلئے ہمیں طویل راستے طے کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر ہم اپنے وجود کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو اس میں ایمان کی چنگاریاں نظر آتی ہیں قرآن مجید فرماتا ہے:

"ونحن اقرب الیه من حبل الورید"

(سورہ ق آیہ ۱۶)

ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اسکے قریب ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) انسانی عادت اور انسانی فطرت کے متعلق چند مثالیں پیش کریں؟

۲) نادان لوگ بت پرستی کیوں کیا کرتے تھے؟

۳) مادہ پرستوں نے خدا کا نام طبیعت (مادہ) کیوں رکھ دیا ہے؟

پانچواں سبق

ایک سچا واقعہ

ہم نے کہا تھا کہ جو لوگ زبان سے خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں دراصل ان کی روح کی گہرائیوں میں خدا پر ایمان کا جذبہ مضمر ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سی کامیابیاں اکثر غرور پیدا کردیتی ہیں خصوصا یہ چیز کم ظرف لوگوں میں زیادہ دیکھی جاسکتی ہے۔ اور یہی غرور انہیں یاد خدا سے غافل کردیتا ہے حتی کہ کبھی کبھی انسان خود اپنے فطری تقاضے بھی فراموش کردیتا ہے لیکن جس وقت طوفان کے تھپیڑے اس کی زندگی کو درہم برہم کردیتے ہیں اور مشکلات کی تند و تیز آندھیاں چاروں طرف سے اسے گھیر لیتی ہیں تو غرور اور خود پسندی کے سارے پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور خدا کی وحدانیت اور خدا کی معرفت کا جذبہ اسکی جگہ لے لیتا ہے۔

انسانی تاریخ میں اس قسم کے افراد کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ان میں سے ایک داستان پیش کی جاتی ہیں:

کسی زمانے میں ایک بہت طاقتور وزیر گزرا، جس نے اپنے زمانے میں بہت اثر و رسوخ حاصل کرلیا تھا اور کسی کو اسکی مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی، ایک دن کسی محفل میں

کچھ مذہبی علما بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ وزیر وہاں آ گیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ تم لوگ کب تک یہ کہتے رہو گے کہ دنیا کا کوئی خدا ہے؟ میرے پاس اسکی نفی کیلئے ہزاروں دلیلیں موجود ہیں۔

اس نے یہ جملہ بڑے غرور ونخوت کیساتھ کہا تھا! اس محفل میں موجود علما جانتے تھے کہ وہ منطق واستدلال سے بے بہرہ ہے اور طاقت واثر ورسوخ نے اسے اتنا مغرور بنادیا ہے کہ کوئی بھی حق بات اس پر اثر نہیں کرے گی لھذا بے اعتنائی کے ساتھ اس کی اس بات پر خاموش رہے لیکن علماء کی یہ خاموشی بامعنی اور تحقیر آمیز تھی۔ اس واقعہ کے چند روز بعد وزیر پر کچھ الزامات عائد ہوئے اور حکومت وقت نے اس کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

اس روز کی محفل میں موجود علماء میں سے ایک نے سوچا کہ اس وزیر کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا یہ اچھا موقع ہے اب چونکہ اسکا غرور ٹوٹ چکا ہے اور خود غرضی اور تکبر کے تمام پردے اسکی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں لھذا حق کو قبول کرنے کی حس اس میں بیدار ہوگئی ہوگی چنانچہ اگر اس وقت اسے نصیحت کی جائے تو سودمند ثابت ہوگی چنانچہ وہ عالم ملاقات کی اجازت لے کر وزیر سے ملنے کے لئے قید خانہ میں آیا جب عالم اسکے نزدیک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سلاخوں کے پیچھے کمرے میں تنہا وزیر ٹہل رہا ہے اور وزیر لب کچھ اشعار گنگنا رہا ہے اس نے غور سے سنا تو وزیر یہ مشہور اشعار پڑھ رہا تھا!

ما همه شیران ولی شیر علم
حمله مان از باد باشد دم بدم
حمله من پیدا و ناپیدا است باد
جان فدای آن که ناپید است باد

یعنی ہم ان شیروں کی تصویروں کی مانند ہیں کہ جنھیں پرچم پر بنادیا گیا ہے جس وقت ہوا چلتی ہے اور پرچموں میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ آور ہو رہے ہیں لیکن اصل میں خود انکی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور یہ محض ہوا کی حرکت ہے جو ان کو طاقت عطا کرتی ہے۔ ہم خواہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائیں ہماری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے وہ خدا جس نے ہمیں یہ طاقت عطا کی ہے جب بھی چاہے اسے ہم سے چھین سکتا ہے۔

عالم دین نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ اب وزیر خدا کا منکر نہیں رہا بلکہ ایک پر جوش خداشناس بن چکا ہے فوراً اسکے پاس جا کر احوال پرسی کی اور کہا: کیا آپکو یاد ہے کہ ایک روز آپ نے کہا تھا کہ خدا کے وجود کی نفی کیلئے میرے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں؟ اب میں آپ کے پاس اس لیئے آیا ہوں کہ ان ہزاروں دلیلوں کا صرف ایک دلیل کیساتھ جواب دوں اور وہ دلیل یہ ہے کہ: خداوہ ہستی ہے کہ جسنے اتنی آسانی کیساتھ تم سے وہ عظیم الشان طاقت چھین لی ہے کہ جس پر تو ناز کیا کرتا تھا، وزیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اپنی غلطی کا معترف ہو چکا تھا اور اپنی روح میں خدا کے نور کا جلوہ دیکھ رہا تھا۔

قرآن مجید میں فرعون کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

"حتی اذا ادرکه الغرق قال آمنت انه لا اله الا الذی آمنت به بنو اسرائیل" (سورۂ یونس آیہ ۹۰)

(فرعون خدا کا انکار کرتا رہا) یہانتک کہ (دریا کی امواج میں) غرق ہونے کو تھا (تو اس وقت) کہا کہ میں ایمان لاتا ہوں کوئی معبود نہیں سوائے اس ذات کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) مختصراً بتائیں کہ اس سچی داستان سے آپ نے کیا نتیجہ حاصل کیا؟

۲) بنی اسرائیل کو "بنی اسرائیل" کیوں کہتے ہیں؟

۳) فرعون کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ اور اس نے کیا دعویٰ کیا تھا؟

چھٹا سبق

خدا کی معرفت کیلئے دوسرا راستہ

بیرونی راستہ

اگر ہم اس جہان پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ کائنات کا نظام ہرگز درہم و برہم نہیں ہے بلکہ تمام مظاہر قدرت اپنی معینہ راہ پر گامزن ہیں اور دنیا کی تمام مشیزی ایک عظیم الشان لشکر کی مانند انتہائی منظم یونٹوں میں تقسیم ہو کر اپنے معین مقصد کی طرف حرکت میں مصروف ہے۔

اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو درج ذیل نکات کے ذریعے برطرف کیا جاسکتا ہے:

۱) ہر زندہ مخلوق کے عالم وجود میں آنے اور باقی رہنے کیلئے کچھ خاص قوانین اور حالات کو ایک سلسلے کیساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے،

مثلاً ایک درخت کے وجود میں آنے کیلئے: زرخیز زمین، مناسب آب وہوا اور مخصوص درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان مخصوص شرائط کے مطابق بیج بویا جائے، وہ اپنی مخصوص غذا اور ہوا سے خوب فائدہ اٹھائے، سبز ہو جائے اور خوب نشوونما کرے

درخت کی نشو ونما کیلئے ایک مخصوص ماحول اور زمین کا انتخاب کرنے اور دیگر ضروری چیزوں کی فراہمی کیلئے عقل اور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲) تمام موجودات اپنی مخصوص جداگانہ تاثیر رکھتے ہیں۔ آگ اور پانی کی اپنی الگ الگ خاصیت ہے جسمیں تبدیلی وتغیر ممکن نہیں ہے اور ہمیشہ ایک مقررہ قانون کے مطابق وہ اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔

۳) زندہ موجودات کے تمام اعضا کا آپس میں ایک دوسرے کیساتھ انتہائی منظم رابطہ ہوتا ہے مثال کے طور پر انسان کے جسم میں: ایک پوری دنیا آباد ہے آپریشن کے وقت انسانی بدن کے تمام اعضاء میں ارادی اور غیر ارادی طور پر ایک خاص قسم کی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے مثلاً اگر کوئی خطرہ درپیش ہے تو تمام اعضا اسکی مدافعت کیے لیئے آمادہ ہوجائیں گے! یہ قریبی تعلق اور آپس میں ہم آہنگی اور ارتباط، کائنات کے نظم وضبط کی ایک زندہ مثال ہے۔

۴) نظام کائنات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ نہ صرف زندہ موجودات کے اعضا اور جسم میں بلکہ دنیا کی دوسری مخلوقات میں بھی آپس میں ایک قسم کا ارتباط اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے مثلاً زندہ ومتحرک مخلوقات کی پرورش اور نشو ونما کیلئے سورج اپنی حرارت اور روشنی پہنچاتا ہے، بادل پانی برساتے ہیں، ہوائیں چلتی ہیں اور زمینی ذخیرے بھی اسمیں مدد کرتے ہیں یہ چیزیں کائنات میں ایک معین نظام کے وجود کی نشاندہی کرتی ہیں۔

عقل اور نظم وضبط میں رابطہ

ہم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ کسی بھی مشینری کے نظم وضبط سے اسکے بنانیوالے کی عقل وفہم، منصوبہ بندی اور اسکے مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان جہاں بھی ایک مکمل نظم وضبط اور مستحکم قوانین کارفرما دیکھتا ہے تو جانتا ہے اس نظام کو خلق کرنے والی عالم وقادر ذات بھی ہے اور اس حقیقت کو درک کرنے پر اپنے اندر کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

وہ جانتا ہے کہ کبھی بھی ایک نابینا اور جاہل شخص ٹائپنگ مشین سے ایک خوبصورت تحریر یا ایک سماجی وتنقیدی مقالہ نہیں لکھ سکتا! اور کبھی بھی ایک دو سالہ بچے کے کاغذ پر یونہی بے ترتیب قلم چلادینے سے ایک خوبصورت پینٹنگ تیار نہیں ہوسکتی! بلکہ اگر ہم ایک دلکش تحریر یا اعلی درجے کا مقالہ دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ یہ کسی اعلی درجے کے تعلیم یافتہ دانشور کے زور قلم کا نتیجہ ہے یا اگر کسی عجائب گھر میں انتہائی خوب صورت پینٹنگ دیکھیں گے تو شک نہ کریں گے کہ یہ کسی ماہر فن آرٹسٹ کی کوشش کا نتیجہ ہے اگرچہ اس مقالے کے مصنف یا پینٹنگ کے آرٹسٹ کو ہم نے دیکھا بھی نہ ہو۔

لھذا جہاں کہیں بھی کوئی منظم مشیزی کارفرما ہوتی ہے اسکے ساتھ ہی ساتھ عقل وفہم کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس قدر وہ مشیزی بڑی ہوگی اسی کے مطابق وہ اتنی ہی پیچیدہ اور قابل قدر ہوگی اور اس کا ایجاد کرنے والا بھی اتنا ہی اعلی درجے کی عقل وفراست کا مالک ہوگا۔

اس موضوع کو ثابت کرنے کیلئے کہ ہر منظم مشیزی کو عقل، علم کے مالک کی ضرورت

ہوتی ہے۔ ریاضی کے حساب احتمالات Theory Of Probability سے مدد لیں گے۔

اس علم ریاضی کی مدد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مثلاً اگر ایک جاہل آدمی چاہے کہ ٹائپ کی مشین سے اتفاقیہ طور پر مشین کے بٹنوں کو دبا دبا کر ایک مقالہ یا اشعار کا ایک قطعہ ٹائپ کرے تو حساب احتمالات کے مطابق اسکو کروڑوں برس درکار ہونگے یہاں تک کہ کرہ زمین کی پوری عمر بھی اس کام کیلئے ناکافی ہوگی۔

مزید وضاحت اور تفصیلات کیلئے فارسی زبان میں تحریر کتب ''آفریدگار جہان'' اور ''در جستجوی خدا'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

"سنریھم آیاتنا فی الافاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انه الحق او لم یکف بربک انه علی کل شیء شھید" (سورہ فصلت آیہ ۵۳)

عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائیگا کہ یقیناً وہی حق ہے کیا آپ کے رب کا ہر چیز سے واقف و آگاہ ہونا کافی نہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) چند ایسی صنعتی مشینوں کے نام بتایئے کہ جن کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بنانے والا ماہر اور ہوشیار ہے۔

۲) آفاق اور انفس میں کیا فرق ہے۔ آفاق اور انفس میں خدا کی نشانیوں میں سے کچھ مثالیں پیش کیجیے۔

ساتواں سبق

نظام کائنات سے چند مثالیں

کائنات کے ذرہ ذرہ سے نظم وضبط، منصوبہ بندی اور اسکی تخلیق کے مقصد کا اظہار ہوتا ہے اسکے لیئے ہم یہاں پر بطور مثال کچھ چھوٹے بڑے حقائق کا تذکرہ کرتے ہیں:

خوش قسمتی سے آج سائنسی علوم کی ترقی، عالم طبیعت کی نیرنگیوں ، انسانوں، حیوانات اور نباتات کے وجود کے اندر چھپی ہزاروں باریکیوں کے اسرار و رموز کے منکشف ہوجانے، ایک ذرہ (cell) اور ایک ایٹم میں چھپی بے پناہ طاقت کا راز معلوم ہوجانے تیز ستاروں کی حیرت انگیز دنیا کے نظام سے آشنا ہوجانے سے خدا کی معرفت کے دروازے ہم پر کھل گئے ہیں۔

بلا خوف وتردید کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی علوم کی ساری کتابیں دراصل توحید اور خدا کی معرفت کی کتابیں ہیں کہ جو ہمیں پروردگار کی عظمت کا درس دیتی ہیں کیونکہ ان کتابوں میں اس کائنات کی مخلوقات کے دلکش نظام کے رازوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا کس قدر عالم وقادر ہے۔

۱) ہمارے جسم کی مملکت کا مرکز

ہماری کھوپڑی کے اندر خاکستری رنگ کا مادہ بھرا ہوا ہے جسے دماغ کہتے ہیں یہ دماغ ہمارے جسم کی سب سے اہم اور پیچیدہ ترین مشینری کا کام دیتا ہے یہی مشینری ہمارے پورے بدن کی طاقتوں کو کنٹرول کرتی ہے اور دیگر تمام مشینریوں کے نظام کو برقرار رکھتی ہے۔

اس عظیم مرکز کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل ایک سچے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

اخبارات میں آیا تھا کہ کار کے ایک حادثہ میں شیراز کے ایک نوجوان طالب علم کو خوزستان کے علاقے میں دماغ میں چوٹ لگ گئی بظاہر اس کے جسم کے تمام اعضاء بالکل صحیح وسالم تھے لیکن دماغ پر چوٹ لگنے کے نتیجہ میں حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ وہ اپنی تمام گذشتہ زندگی کو فراموش کر بیٹھا اگر چہ اسکا دماغ صحیح طور پر کام کر رہا تھا اور وہ ہر بات کو سمجھتا بھی تھا مگر اپنے ماں باپ کو نہیں پہچانتا تھا۔ جب اس سے کہا جاتا کہ یہ تمہاری ماں ہے تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگتا! اسے شیراز میں اسکے گھر لے جایا گیا اور اسے اسکے ہاتھ کی بنائی ہوئی اشیاء جو کہ اسکے کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھیں دکھائی گئیں لیکن وہ سب چیزوں کو حیرت سے دیکھتا رہا اور کہتا رہا کہ میں ان سب چیزوں کو پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔

معلوم یہ ہوا کہ دماغی چوٹ کی وجہ سے وہ خلیے (cells) بیکار ہوگئے تھے جو اسکے سوچنے سمجھنے کی طاقت اور اسکی یادداشت وحافظہ میں ارتباط پیدا کرنے والے تاروں کا کام انجام دے رہے تھے، اور جس طرح بجلی کا فیوز اڑ جانے سے بجلی منقطع ہوجاتی ہے اور تاریکی چھاجاتی ہے اسی طرح سے اسکی یادداشت پر فراموشی کی تاریکی چھا گئی تھی

دماغ کا وہ ایک نقطہ جو معطل اور مفلوج ہوگیا تھا شاید سوئی کی نوک سے زیادہ بڑا نہ تھا لیکن اس نوجوان کی زندگی پر اس نے کتنا زبردست اثر چھوڑا تھا! اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہماری دماغ کی مشیزی کتنی پیچیدہ اور کتنی اہمیت کی حامل ہے۔

دماغ کے اعصابی نظام کا تعلق دو مختلف حصوں سے ہے:

۱) پہلا حصہ جو ارادی نظام کو کنٹرول کرتا ہے یعنی ہمارے بدن کی تمام اختیاری حرکات مثلاً چلنا دیکھنا بولنا وغیرہ اسی کے تحت انجام پاتی ہیں۔

۲) دوسرا حصہ غیر ارادی نظام یعنی دل اور معدہ کی حرکات اور اسی طرح کی مشینریوں کے نظام کو چلاتا ہے اور دماغ کے اس حصے کے ایک گوشے کے بیکار ہوجانے سے دل یا دوسری مشیزیاں بیکار ہوجاتی ہیں۔

دماغ کا سب سے عجیب وغریب حصہ: مغز

''مغز'' انسان کے ہوش وحواس، ارادہ وشعور اور حافظہ کا مرکز ہے یا مختصر الفاظ میں یوں کہیں کہ ''مغز'' دماغ کا سب سے اہم اور حساس ترین حصہ اور ہمارے اندرونی جذبات اور ذہنی ردعمل مثلاً غصہ، خوف اور اسی قسم کی دوسری کیفیات کا تعلق اسی حصہ سے ہے۔

اگر ایک جاندار کا مغز نکال لیا جائے اور اسکے باقی تمام اعصاب صحیح وسالم رہیں تو وہ زندہ تو رہے گا لیکن اسکی فہم وشعور بالکل ختم ہوجائیں گے، ایک کبوتر کا مغز نکال لیا گیا اس کے بعد وہ کچھ دن زندہ رہا لیکن جب اسکے سامنے دانہ ڈالا جاتا تو وہ بھوک کے باوجود اسے منہ نہیں لگاتا تھا اور اگر اسکو پرواز کیلئے آمادہ کیا جاتا تو اس وقت تک پرواز کرتا رہتا جب تک کہ کسی چیز سے ٹکرا کر خود ہی نہ گر جاتا۔

دماغ کا ایک اور حیرت انگیز حصہ: حافظہ

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ہماری یادداشت اور حافظہ کی قوت کس قدر عجیب و غریب ہے؟ اگر ہم سے ایک گھنٹے کیلئے بھی حافظہ (یادداشت) کی قوت چھین لی جائے تو ہم کس مصیبت میں گرفتار ہوجائیں گے؟

حافظے کا مرکز جو کہ ہمارے دماغ کا ایک نہایت چھوٹا سا حصہ ہے پوری زندگی کی یادوں کو اپنی تمام خصوصیات کیساتھ محفوظ کئے رکھتا ہے، ہر وہ شخص جس سے ہمارا تعلق ہے اسکی خصوصیات، شکل وصورت، رنگ، لباس اخلاق و ادب غرضیکہ ہر چیز کو محفوظ کر کے ہر چیز کی ایک الگ فائل بناتا ہے لہذا اس شخص کا سامنا ہوتے ہی فوراً ہماری فکر ان تمام فائلوں کے انبار سے اسکی فائل باہر نکال لیتی ہے اور فوراً اس فائل پر ایک نظر ڈال کر ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ ہم اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کریں! اگر دوست ہے تو اسکا احترام کیا جائے اور اگر دشمن ہے تو اس سے نفرت کا اظہار کیا جائے! لیکن یہ تمام کام چشم زدن میں سرعت کیساتھ انجام پا جاتے ہیں۔

مزید تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے حافظے میں موجود ہے اسے اگر ہم چاہیں تو کاغذ پر تصویروں کے ذریعے یا کیسٹ میں محفوظ بھی کر سکتے ہیں بلاشک وشبہ اس کام کے لیئے بہت سے اوراق اور کیسٹ درکار ہونگے کہ جن سے ایک بڑا اسٹور روم بھر سکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز چیز تو یہ ہے کہ اس انبار سے ایک تصویر یا ایک کیسٹ نکالنے کیلئے افراد کی ضرورت ہوگی لیکن ہمارا حافظہ ان تمام کاموں کو انتہائی سادگی اور سرعت کیساتھ تنہا ہی انجام دیتا ہے۔

بے شعور طبیعت کس طرح باشعور چیزوں کی تخلیق کرسکتی ہے؟

انسانی دماغ کی حیرت انگیز باریکیوں کے بارے میں ہزاروں کتابیں لکھی جاچکی ہیں اوران میں سے متعدد کتب اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

کیااس بات پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ غیر معمولی، عجیب وغریب، پیچیدہ اور پراسرار مشیزی ایک بے شعور مادہ نے پیدا کی ہے؟ اور کیا یہ اس بات سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات نہیں کہ ہم عقل سے بے بہرہ مادہ کو عقل کا خالق جان لیں؟

قرآن مجید میں ارشاد ہورہا ہے:

"...... وفی انفسکم افلا تبصرون"

(ذاریات آیت ۲۱)

تمہارے وجود کے اندر خدا کی عظمت وبزرگی کی عظیم نشانیاں موجود ہیں کیا تم نہیں دیکھتے؟

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) انسانی دماغ کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے بارے میں کچھ تحریر کریں۔

۲) خداوند عالم نے انسانی دماغ کو گوناگوں حوادث سے بچانے کیلئے کیا تدابیر فرمائی ہیں؟

آٹھواں سبق

ایک چھوٹے سے پرندے میں عجائبات کی دنیا

چمگادڑ اور اس کی عجیب وغریب خلقت

اس سبق میں ہم چاہتے ہیں کہ اپنے جسم سے جو ایک بہت بڑے ملک کی مانند ہے اور ابھی ہم نے اسکے مختلف شہروں کی ایک گلی کو بھی نہیں دیکھا باہر آئیں اور کائنات میں ہر جگہ گھومیں اور موجودات عالم کے دیگر حیرت انگیز نظاموں کی چند مثالوں کا جائزہ لیں:

شب کی تاریکی میں اگر ہم آسمان کی طرف ایک نظر کریں تو وہاں پر ایک خاص قسم کے پرندے کو رات کے سیاہ پردوں میں پراسرار سایہ کی مانند اڑتا ہوا دیکھتے ہیں جو نہایت دلیری کے ساتھ اپنی غذا کے حصول کیلئے ادھر اُدھر محو پرواز ہوتا ہے۔

یہ پرندہ ''چمگادڑ'' کہلاتا ہے گو کہ اسکی ہر چیز ہی حیرت انگیز ہے لیکن رات کے اندھیرے میں کسی بھی چیز سے ٹکرائے بغیر اسکا تیزی سے اڑنا اس قدر تعجب خیز ہے کہ اس سلسلے میں جتنا بھی مطالعہ کیا جائے اس پراسرار پرندے کے بارے میں اتنے ہی نئے نئے انکشافات ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ پرندہ تاریکی میں اتنی ہی تیزی اور دلیری کیساتھ حرکت کرتا ہے جتنی تیزی اور دلیری

کیساتھ ایک تیز رفتار کبوتر دن کی روشنی میں پرواز کرتا ہے، اور یہ بات مسلّم ہے کہ اگر اسکے پاس رکاوٹوں کا علم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا تو وہ اس جرأت سے ہرگز پرواز نہ کرسکتا! اگر اس کو ایک نہایت تنگ وتاریک اور پرپیچ سرنگ میں کہ جہاں دھواں بھی بھرا ہوا ہو چھوڑ دیا جائے تو وہ تمام پیچ وخم سے باآسانی اور سرنگ کی دیواروں سے ٹکرائے بغیر گذر جائے گا اور اسکے پروں پر دھویں کا ذرا سا بھی اثر نہ ہوگا۔

چمگادڑ کی یہ عجیب وغریب خصوصیت ''راڈار'' کی خصوصیات کے مشابہ ہے (بلکہ حقیقتاً راڈار کی خصوصیت چمگادڑ کی خصوصیات کے مشابہ ہے) پہلے ہم راڈار کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اس پرندے کے چھوٹے سے وجود کی بناوٹ کو جان سکیں۔

علم فزکس Physics میں ''آواز'' کی بحث کے دوران آواز سے ماوراء لہروں کا ذکر بھی سنتے ہیں، یہ لہریں وہی لہریں ہیں کہ جنکی لمبائی، تکرار اور تعداد (یعنی frequence) اتنی زیادہ ہے کہ انسان کے کان انہیں درک کرنے سے قاصر ہیں اسی لیے ان لہروں کا نام ''ماوراء صوت'' رکھا گیا ہے۔

جس وقت ان لہروں کو ایک طاقتور ٹرانسمیٹر کے ذریعے چھوڑا جاتا ہے تو یہ لہریں چاروں جانب آگے کی طرف بڑھتی ہیں لیکن اگر فضا کے کسی نقطہ میں ایک دیوار یا رکاوٹ (Barrier) مثلاً دشمن کا ہوائی جہاز یا کسی دوسری قسم کی رکاوٹ کا سامنا ہو جائے تو اسکا انجام وہی ہوتا ہے جسطرح سے ایک گیند کا دیوار سے ٹکرانے کے بعد انجام ہوتا ہے کہ وہ واپس لوٹ آتا ہے بالکل اسی طرح اگر ہم ایک پہاڑ یا بلند دیوار کے پاس آواز لگائیں تو چند لمحوں کے بعد اسکی بازگشت سنائی دیتی ہے تو ممکن ہے ہے ان لہروں کی بازگشت سے اس رکاوٹ کے فاصلہ کا بالکل صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بہت سے ہوائی اور بحری جہاز ''راڈار'' کے ذریعے ہی کنٹرول کیے جاتے ہیں اور اسکی راہنمائی سے ہی اپنے اپنے راستے پر گامزن رہتے ہیں اسکے علاوہ دشمن کے طیاروں اور بحری جہازوں کا پتہ لگانے کیلئے بھی راڈار سے مدد لی جاتی ہے۔

دانشور کہتے ہیں کہ اس چھوٹے سے پرندے کے وجود کے اندر بھی راڈار جیسی مشین موجود ہے اگر اس کو ایک کمرے میں اڑائیں اور اسی لمحے ایک ایسے مائیکروفون کو لگادیں کہ جو ماوراء آواز لہروں کو سننے کے قابل لہروں میں تبدیل کر دیتا ہے تو کمرے میں کانوں پر گراں گزرنے والی تیز آواز گونجنے لگے گی اور ہر سیکنڈ میں تیس سے لیکر ساٹھ مرتبہ چمگادڑ کی ماوراء آواز لہریں سنائی دینے لگیں گے۔

البتہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لہریں چمگادڑ کے کس عضو کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں یعنی ان لہروں کو بھیجنے والی مشینری (یا Transmitter) کونسی ہے؟ اور انہیں واپس وصول کرنے والی مشینری یا (Receiver) کہاں پر ہے؟

سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ آوازیں چمگادڑ کے حنجرہ (larynx) سے پیدا ہوتی ہیں اور اسکی ناک کے سوراخوں سے باہر فضا میں بھیجی جاتیں ہیں جبکہ اسکے بڑے بڑے کان لہروں کو جذب کرنے والی مشین (یا Receiver) کا کام انجام دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ چمگادڑ اپنی رات کی سیر وسیاحت کیلئے اپنے کانوں کی محتاج ہے۔

''ژورین'' نامی ایک روسی سائنس دان نے تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ اگر چمگادڑ کے کانوں کو کاٹ لیں تو اسے تاریکی میں پرواز کرنے میں مشکل پیش آئے گی لیکن اگر اسکی آنکھوں کو مکمل طور پر نکال دیا جائے تو پھر وہ پوری مہارت کیساتھ پرواز کر سکتی ہے گویا چمگادڑ اپنے کانوں کی مدد سے دیکھتی ہے نہ کہ اپنی آنکھوں سے! اور یہ عجیب وغریب

چیز ہے اسمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس پرندے کے مختصر اور ناچیز جسم میں یہ حیرت انگیز مشینری کس نے رکھی ہے؟ ذرا سوچیے کہ ان دو مشینوں کو استعمال کرنے کا سبق اسکو کس نے دیا ہے؟ کہ وہ انتہائی اطمینان بخش وسیلہ کی وجہ سے رات کی تاریکی میں حرکت کرتا ہوا بیشمار خطرات سے محفوظ رہتا ہے۔

سچ بتائیں کہ وہ ہستی کون ہے؟

آیا یہ ممکن ہے کہ عقل وشعور سے بے بہرہ مادہ ایسا کام انجام دے سکے؟ اور ایک ایسی مشینری (یعنی راڈار) کہ جسے بہت بڑے بڑے دانشور کثیر سرمایہ خرچ کرکے بناتے ہیں اس سادگی کیساتھ اس کے وجود میں رکھ دے؟

شایستہ ستایش آن آفریدگاری است۔
کارد چنین دلاویز نقشی زماء و طینی

لائق حمد وثنا ہے وہ ذات کہ جس نے ایسے دلآویز کام انجام دیئے اور پانی ومٹی سے ایسے دلکش نقش ونگار تخلیق کیے۔

نہج البلاغہ میں چمگادڑ کی خلقت کا تذکرہ

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں چمگادڑ کی خلقت کے بارے ایک مفصل خطبے کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"فلا یردّ ابصارها اسراف ظلمته و لا تمتنع

من المضی فیہ لغسق وجنتہ ...... فسبحان
البارء لکل شیء علی غیر مثال"

(خطبہ نمبر۵۳)

رات کی تاریکیاں چمگادڑ کو دیکھنے سے نہیں روکتیں اور نہ ہی اس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اسے چلنے سے باز رکھتے ہیں ...... پاک و پاکیزہ اور بزرگ و برتر ہے وہ ذات کہ جس نے پہلے سے موجود کسی نمونے اور مثال کے بغیر تمام چیزوں کی تخلیق کی ہے ۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) کیا چمگادڑ کی خلقت کے بارے آپ مزید دلچسپ باتیں جانتے ہیں؟

۲) کیا آپ جانتے ہیں کہ چمگادڑ ایک عدیم المثال پرندہ ہے یعنی اسکے بال و پر اور اسکے بچہ جننے بلکہ اسکے سونے کا انداز بھی دوسرے حیوانات سے مختلف اور جداگانہ ہے؟

نواں سبق

حشرات اور پھولوں کی باہمی دوستی

موسم بہار کی کسی خوشگوار صبح کو کہ جب موسم گرما کی آمد آمد ہو آپ باغات یا سرسبز و شاداب کھیتوں کی سیر پر نکلیں تو سینکڑوں قسم کے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے، شہد کی مکھیاں، بھنورے، تتلیاں اور ننھے ننھے پتنگے آپ کو بغیر کسی شور و غل کے ہر طرف اڑتے ہوئے نظر آئیں گے جو ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول پر بیٹھ رہے ہیں اور اس شاخ سے اس شاخ کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔

یہ سب اپنے اپنے کام میں اتنی سرگرمی کیساتھ مشغول ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیر مرئی اور خفیہ طاقت ایک سنجیدہ حاکم کی مانند ان کے سر پر کھڑی برابر انکو حکم دے رہی ہے!

پھولوں کے ریشوں کے زرد رنگ میں لتھڑے ہوئے انکے پاؤں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے باوردی مزدور اپنے کارخانے میں انتہائی دلچسپی اور انہماک کیساتھ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں مشغول ہیں۔

بے شک انکو ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہے یہ ذمہ داری اتنی اہم اور بڑی ہے کہ اسکے بارے میں پروفیسر لئون بریٹن (Leon Briton) کہتا ہے کہ: "بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ اگر یہ حشرات نہ ہوتے تو ہمارے پھلوں کی ٹوکریاں خالی رہ جاتیں" ہم اسکی بات کو اس جملے کے اضافے سے آگے بڑھاتے ہیں کہ "ہمارے باغات اور کھیتوں میں جو سبزہ، شادابی اور طراوت نظر آتی ہے وہ چند برسوں کے بعد مکمل طور پر ختم ہو جاتی" کیونکہ یہ حشرات در حقیقت پھلوں کی پرورش کرتے ہیں اور پھولوں کے بیجوں کو تیار کرتے ہیں یقیناً آپ اسکی حقیقت جاننے کے خواہش مند ہونگے اس بات کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ: نباتات کا اہم ترین حیاتی عمل یعنی عمل تخلیق و تلقیح (Fecundatin) ان حشرات کی مدد سے ہی انجام پاتا ہے، یقیناً آپ کے علم میں ہوگا کہ حیوانات کی طرح پھولوں میں بھی نر اور مادہ پائے جاتے ہیں اور جب تک ان کے درمیان جنسی ملاپ کا عمل وقوع پذیر نہ ہو ان میں بیج، پھول اور پھل پیدا نہیں ہوتے۔

لیکن کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ مختلف اقسام کے پیڑ اور پودے جو بے حس و حرکت ہوتے ہیں ان میں ملاپ اور اختلاط کا عمل کس طرح انجام پاتا ہے؟ اور نر پودے اور درخت کے تخم مادہ درختوں اور پودوں کے تخم تک کیسے رسائی حاصل کرتے ہیں اور انکے درمیان ازدواجی تعلقات کیسے قائم ہوتے ہیں؟

ان تعلقات کیلئے سب سے مؤثر رابطے کا ذریعہ حشرات ہیں جبکہ بعض حالات میں ہوا کی مدد سے بھی یہ عمل انجام پاتا ہے۔ لیکن یہ کام ایسا بھی آسان نہیں ہے جیسا کہ ہم خیال کر رہے ہیں بلکہ یہ مبارک اور پر برکت شادی جو حشرات یا ہوا کے ذریعے انجام پاتی ہے اسکے لیے بھی باقاعدہ تیاریاں کی جاتی ہیں، وقت اور تاریخ مقرر کی جاتی ہے

سب کاموں کی انجام دہی میں طویل اور دلچسپ داستان عمل میں آتی ہے اسکا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

دو قدیمی اور مخلص دوست

علوم طبیعات کے ماہرین نے طویل مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نباتات اور پھول، علم جمادات کے دوسرے دور کے دوسرے نصف میں عالم وجود میں آئے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسی دوران حشرات بھی پیدا ہوئے ہیں اور خلقت عالم کی طویل تاریخ میں یہ دونوں وفادار اور گہرے دوستوں کی مانند رہتے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے وجود کی تکمیل کرتے رہے ہیں۔

پھول اپنے دوستوں کا منہ میٹھا کرنے اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے ہمیشہ بے حد مٹھاس اپنے اندر ذخیرہ کرکے رکھتے ہیں اور جس وقت حشرات، نر کے تخم کو مادہ میں منتقل کرنے کے لئے پھولوں کے اندر داخل ہوتے ہیں تو پھول یہ مٹھاس انکو پیش کرتے ہیں اور یہ خوش ذائقہ رس حشرات کیلئے اسقدر مرغوب ہے کہ وہ بے اختیار اسکی طرف کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔

بعض ماہرین نباتات (Botanists) کا کہنا ہے کہ: پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور دلکش رنگ و روپ بھی حشرات کو اپنی طرف جذب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، شہد کی مکھیوں پر ہونے والے مختلف تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ پھولوں کے رنگوں میں فرق کو سمجھتی ہیں اور انکی خوشبو بھی سونگھتی ہیں۔

درحقیقت یہ پھول حشرات کیلئے اپنے آپ کو اس طرح سے سجاتے بناتے اور خوشبو

میں اسطرح سے بساتے ہیں کہ باذوق بھنورے اور خوش سلیقہ شہد کی مکھیاں ان کی دلکشی کو دیکھ ان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں اور پھولوں کی دعوت کو قبول کرکے فوراً ہی اس مرحلے کی ابتدائی کاروائیوں کا آغاز کرتے ہوئے انکی شیرینی کو بھی کھا جاتیں ہیں، اور یہی مخصوص قسم کا شیریں رس حشرات کی بہترین غذا مانا جاتا ہے اور جب شہد کی مکھیاں اس مٹھاس کو ایک جگہ جمع کرلیتی ہیں تو شہد تیار ہوجاتا ہے کیونکہ جس وقت یہ حشرات پھولوں کے پاس آتے ہیں تو اس میں سے تھوڑی سے مٹھاس کھاتے ہیں اور ایک بڑی مقدار اپنے چھتے میں لاکر جمع کرلیتے ہیں!

محبت اور دوستی کا یہ رشتہ کہ جس میں دونوں کا فائدہ مضمر ہے ہمیشہ سے حشرات اور پھولوں کے درمیان قائم ہے اور قائم رہے گا۔

توحید کا ایک درس

جب انسان پھولوں اور حشرات کی زندگی کے ان دلکش اور حیرت انگیز نکات کا مطالعہ کرتا ہے تو بے اختیار اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ پھولوں اور حشرات کے درمیان محبت و دوستی کا یہ رشتہ کس نے قائم کیا ہے؟ پھولوں کو یہ مخصوص مٹھاس اور خوش ذائقہ غذا کس نے دی ہے؟

پھولوں کو یہ دلکش رنگ و روپ اور خوشبو کس نے عطا کی ہے کہ جسکی وجہ سے حشرات انکی طرف بے اختیار کھنچے چلے آتے ہیں؟

کیڑوں بھنوروں، شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کو یہ دلکشی و رعنائی اور نازک پاؤں کس نے عطا کیے ہیں کہ وہ پھولوں کے تخموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام

انجام دیتے ہیں؟

شہد کی مکھیاں ایک مدت تک کسی خاص قسم کے پھولوں کی طرف ہی کیوں متوجہ رہتی ہیں؟

اور اس کائنات میں حشرات اور پھولوں کی زندگی کی تاریخ کا آغاز ایک ساتھ کیوں ہوا ہے؟

آیا کوئی بھی انسان خواہ وہ کتنا ہی ہٹ دھرم کیوں نہ ہو اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ یہ تمام واقعات پہلے سے کوئی اسکیم اور پروگرام بنائے بغیر ظہور میں آئے ہیں اور بے حس و حرکت مادہ ان حیرت انگیز واقعات کو خود بخود وجود میں لے آیا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

"و اوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا و من الشجر و مما یعرشون ثم کلی من کل الثمرات فاسلکی سبل ربک ذللا"

(سورہ نحل آیت ۶۸، ۶۹)

تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں، درختوں میں اور ان میں جو چھتیں لوگ بناتے ہیں ان میں اپنے چھتے بنا پھر ہر طرح کے پھولوں سے ان کا عرق چوس، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر تابعداری سے چلی جا۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) پھولوں کی مٹھاس اور ان کے رنگ و بو کے کیا فوائد ہیں؟

۲) شہد کی مکھیوں کی دلچسپ زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

دسواں سبق

چھوٹی مخلوقات کے بے انتہا وسیع جہان میں

چونکہ ہم اس کائنات کی گوناگوں نیرنگیوں کے درمیان پرورش پا رہے ہیں اسی لیے ہمیں انکی ایک طرح سے عادت سی ہوگئی ہے لھذا عین ممکن ہے کہ ہم بہت سے حیرت انگیز موجودات کی اہمیت سے ہی بے خبر ہوں مثال کے طور پر:

۱) ہمارے اردگرد ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے اور جانور زندگی گزار رہے ہیں کہ جن میں سے بعض شاید ایک دو ملی میٹر سے بھی چھوٹے ہوں لیکن اسکے باوجود وہ کسی بڑے جانور کی طرح ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، کان، حتی کہ دماغ، سمجھ، اعصاب اور ہاضمہ کا نظام تک رکھتے ہیں، اگر ایک چیونٹی کے دماغ کو مائیکرسکوپ سے دیکھیں اور اس کی حیرت انگیز بناوٹ پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ اس کی ساخت انتہائی عجیب وغریب اور دلچسپ ہے اس کے مختلف حصے ہیں جن میں سے ہر ایک چیونٹی کے چھوٹے سے جسم کے مخصوص حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ حصے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چنے ہوئے ہیں اور ان کی وضع میں ذراسی بھی تبدیلی چیونٹی کے بدن کے کسی حصے کو ناکارہ بنادیتی ہے۔

اس سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسکے مختصر دماغ میں کہ جو پن (Pin) کی نوک سے

بھی چھوٹا ہے ہوش وخرد، تمدن، ذوق وہنر کی ایک دنیا پنھاں ہے اور سائنس دانوں کے بڑے بڑے گروہوں نے اپنی زندگیوں کا ایک طویل عرصہ اس جاندار کی زندگی کے مطالعہ میں صرف کرکے اسکے بارے میں حیرت انگیز اور دلچسپ نکات کا انکشاف اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ مادہ ایک چھوٹی سی مخلوق کے اندر یہ تمام ہوش وخرد اور ہنر وذوق، جمع کرسکے؟ حالانکہ خود مادہ کا یہ حال ہے کہ وہ ایک سوئی (pin) کی نوک کے برابر بھی عقل وشعور نہیں رکھتا۔

۲) ایٹم کی حیرت انگیز دنیا:

اب تک سب سے چھوٹی جس چیز کا انکشاف ہوا ہے وہ ایٹم (Atom) اور اسکے اجزاء ہیں ایٹم اس قدر چھوٹا ذرہ ہے کہ طاقتور ترین مائیکروسکوپ کہ جس سے ایک تنکا پہاڑ نظر آتا ہے، اسکو دیکھنے سے قاصر ہے۔

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایٹم کس قدر چھوٹا ہے؟ تو جان لیجئے کہ تمام روئے زمین پر موجود انسانوں سے زیادہ ایٹم پانی کے ایک قطرے میں ہوتے ہیں اور اگر ایک سینٹی میٹر لمبے باریک تار کے پروٹون (Protons) شمار کرنا چاہیں اور اس کام کیلئے ہزاروں افراد کی مدد لیں اور ان میں سے ہر شخص ایک سیکنڈ میں ایک پروٹون جدا کرے تو ان سب کو شمار کرنے کیلئے تیس (۳۰) سے لیکر تین سو (۳۰۰) برس تک کے شب وروز درکار ہونگے۔

جب ایک سنٹی میٹر لمبے باریک تار میں اسقدر ایٹم (اور ایٹمی ذرات) موجود ہیں تو ذرا

اندازہ لگائیں کہ ہمارے آسمان، زمین، آب وہوا، ستاروں اور نظام شمسی میں کسقدر ایٹم موجود ہونگے؟ کیا انسانی فکر اس قسم کے تصور ہی سی تھک نہیں جائے گی؟ اور سوائے خالق کائنات کے کون ان کا حساب لگا سکتا ہے؟

ایٹم توحید کا درس دیتے ہیں

آج کی دنیا میں ایٹم ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ علمی بحث ہے یہ ننھے منے ذرات ہمیں توحید کا درس دیتے ہیں کیونکہ ایٹم کی دنیا میں سب سے زیادہ چار چیزیں قابل توجہ ہیں:

ا۔ غیر معمولی نظم وضبط: ایک سو سے زیادہ ایسے عناصر کا انکشاف ہو چکا ہے کہ جن کے الیکٹرون (Electron) کی تعداد بتدریج ایک سے شروع ہو کر ایک سو سے زیادہ پر ختم ہوتی ہے کیا ایک بے شعور مادہ کے ذریعہ یہ عجیب وغریب نظام اس نظم وضبط سے وقوع پزیر ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں!

۲) طاقتوں کا اعتدال: ہم جانتے ہیں کہ بجلی کی دو قسمیں (Negative-positive) مثبت اور منفی ایک دوسرے کی جانب جھکاؤ رکھتی ہیں در حقیقت وہ الیکٹرون جو بجلی کے منفی چارج رکھتے ہیں اور وہ نیوکلیس (Nucleus) جو مثبت چارج رکھتے ہیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نیوکلس کے گرد الیکٹرونوں کے دائروں میں گردش کرنے سے مرکز سے دور کرنے والی طاقت (قوت دافعہ) وجود میں آتی ہے اور مرکز سے دور ہٹانے والی طاقت چاہتی ہے کہ الیکٹرونوں کو ایٹم کے آس پاس سے دور ہٹا دے اور ایٹم کے

اجزاء کو الگ کر دے جبکہ قوت جاذبہ چاہتی ہے کہ الیکٹرونوں کو جذب کرے اور ایٹم کو ختم کر دے۔

یہاں پر دیکھنا چاہیے کہ کس طرح نہایت باریکی اور مہارت کے ساتھ قوت جاذبہ اور قوت دافعہ بیک وقت ایٹم میں شامل ہیں کہ جنکی وجہ سے نہ تو الیکٹرون فرار ہو سکتے ہیں اور نہ ہی جذب ہو سکتے ہیں بلکہ ہمیشہ حالت اعتدال میں اپنی حرکت کو جاری رکھتے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ اندھا اور بہرہ مادہ اس طرح کا توازن اور اعتدال وجود میں لا سکے؟

۳) ہر مخلوق اپنے معین راستے پر گامزن ہے: جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ بعض ایٹوں میں متعدد الیکٹرون ہوتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام الیکٹرون ایک ہی مدار میں حرکت کریں بلکہ یہ الیکٹرون کروڑوں سال سے متعدد مداروں میں معین فاصلوں پر اور اپنے اپنے راستوں پر (یعنی اپنی اپنی سرحدوں کے اندر رہتے ہوئے) تیزی کیساتھ حرکت کر رہے ہیں اور اس میں کوئی تغیر یا تبدیلی بھی واقع نہیں ہوتی۔ کیا ان میں سے ہر ایک کا معین مداروں میں رہنا اور گردش کا یہ حیرت انگیز نظام کوئی معمولی اور سادہ بات ہے؟

۴) ایٹم کی عظیم طاقت: اس کا اندازہ لگانے کیلئے صرف یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ۱۹۴۵ء میں میکسیکو (Mexico) کے بے آب وگیاہ صحرا میں ایک ایٹمی تجربہ کیا گیا، ایک بہت چھوٹے سے ایٹم بم کو ایک فولادی مینار سے چھوڑا گیا، دھماکہ ہوا اور فولادی مینار پگھل کر بھاپ بن گیا اور ایک خوفناک آواز اور بجلی پیدا ہوئی جب اسکو دیکھنے کیلئے سائنس دان وہاں پہنچے تو وہاں پر فولادی مینار کا نام ونشان تک نہ تھا۔

اسی سال امریکا نے جاپان کے دو شہروں ناگا ساکی اور ہیروشیما پر دو چھوٹے ایٹم بم پھینکے ناگا ساکی میں ستر (۷۰) ہزار افراد مارے گئے اور [illegible]

جبکہ ہیروشیما میں تیس ہزار سے چالیس ہزار کے درمیان افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اتنے ہی زخمی بھی ہوئے جسکی وجہ سے جاپان نے امریکا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

کیا ایک چھوٹے سے ایٹمی ذرّے کے اسرار و رموز کا مطالعہ اس امر کیلئے کافی نہیں ہے کہ وہ ہمیں اسکے خالق سے آشنا کردے؟

لھذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے وجود پر ہمارے پاس اتنی ہی دلیلیں موجود ہیں کہ جتنی تعداد میں ایٹم دنیا میں موجود ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہو رہا ہے:

"ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام و البحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ" (لقمان آیت ۲۷)

اگر روئے زمین پر موجود تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر اسکی سیاہی بنے جسکے بعد سات سمندر اور سیاہی بنیں تب بھی خدا کے کلمات (مخلوقات) تمام نہیں ہونگے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) ہماری بتائی گئی باتوں کے علاوہ چیونٹی کی پراسرار زندگی کے بارے میں آپ کیا کچھ جانتے ہیں؟

۲) کیا آپ تختہ سیاہ پر ایک ایٹم کی ساخت کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں؟

دسویں سبق کیلئے ایک تکمیلی بحث

خداوند عالم کی شاندار صفات

کیا خدا کی صفات کو پہچاننا آسان ہے؟ جہان خلقت کے اسرار و رموز کے مطالعہ کے ذریعے خدا کے وجود کو پہچاننا جس قدر آسان ہے اسی قدر خدا کی صفات کو پہچاننا مشکل ہے اور اسکے لیئے شدید غور و فکر اور بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

یقیناً آپ اسکا سبب دریافت کرنا چاہیں گے؟ اسکا سبب بہت واضح ہے کیونکہ ہماری کسی بھی چیز سے اور جو کچھ ہم اس وسیع کائنات میں دیکھ اور سن رہے ہیں خدا اس سے مشابہت نہیں رکھتا؛ لھذا خداوند متعال کی صفات کو پہچاننے کی پہلی شرط اسکی مقدس ذات سے تمام مخلوقات کی صفات کی نفی کرنا ہے یعنی عالم مادہ میں سے کسی ایک سے بھی اسکو تشبیہ نہ دینا، اس مقام پر نہایت احتیاط کی ضرورت ہوگی کیونکہ ہم مادی جہان میں پلے بڑھے ہیں؛ ہمارا ہر وقت مادی چیزوں سے تعلق رہا ہے اور اسی سے مانوس ہیں لہٰذا ہم اپنے مادی رجحان کی وجہ سے تمام چیزوں کو اسی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

بالفاظ دیگر: ہم نے اس دنیا میں جو کچھ بھی دیکھا ہے وہ جسم اور جسمانی خصوصیات کا حامل ہے یعنی تمام موجودات ہر معین زمان و مکان میں مخصوص شکل و صورت رکھتے ہیں ان حالات میں ایک ایسی ہستی کا تصور کرنا کہ جو نہ جسم رکھتی ہے اور نہ ہی زمان و مکان، مگر اسکے باوجود تمام زمان و مکان کا احاطہ کیئے ہوئے ہو نہایت ہی مشکل امر ہے لھذا یہ بات بہت ضروری ہے کہ نہایت غور و فکر کیساتھ اس راہ پر قدم رکھا جائے۔

البتہ اس نکتہ کی یاد آوری بہت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ: ہم خدا کی ذات کی حقیقت کبھی بھی درک نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسکی امید رکھنی چاہیے کیونکہ یہ امید اور خیال ایسے ہی خام ہے جیسے سمندر کو کوزے میں بند کرنا یا ماں کے شکم میں موجود بچے کا بیرونی دنیا سے باخبر ہو جانا، کیا یہ چیزیں ممکن ہیں؟

اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک چھوٹی سی لغزش انسان کو خدا کی معرفت کے حقیقی راستے سے کوسوں دور کر دیتی ہے جسکے نتیجے میں وہ بت پرستی اور مخلوق پرستی کی سنگلاخ راہوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ (غور فکر کیجئے)۔

مختصر یہ کہ ہمیں انتہائی ہوشیار رہنا چاہیے اور ہرگز خداوند عالم کی صفات کا مخلوقات عالم کی صفات کیساتھ مقابلہ و مقایسہ نہیں کرنا چاہیے۔

صفات جمال وجلال

عموماً خداوند عالم کی صفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

صفات ثبوتیہ:

یعنی وہ صفات جو خدا میں پائی جاتی ہیں۔

صفات سلبیہ:

یعنی جن چیزوں سے اسکی ذات منزہ و مبرا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی ذات میں کون کونسی صفات پائی جاتی ہیں؟

اسکا جواب یہ ہے کہ: ایک لحاظ سے خدا کی صفات بے پایاں اور لامحدود ہیں جب کہ ایک لحاظ سے فقط ایک ہی صفت میں تمام صفات کا خلاصہ بیان کیا جاسکتا ہے کیونکہ تمام صفات ثبوتیہ کو مختصر طور پر ایک جملے میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ: خدا کی ذات ایک لامتناہی ذات ہے، جو ہر لحاظ سے تمام کمالات کی حامل ہے۔

اور صفات سلبیہ کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ: خدا کی ذات ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر سے چونکہ کمالات اور نقائص کے درجات ہوتے ہیں یعنی بے انتہا کمال اور بے انتہا نقص کا تصور کیا جاسکتا ہے لھذا یوں کہا جاسکتا ہے کہ: خداوند عالم میں انتہا درجے کی صفات ثبوتی اور انتہا درجے کی صفات سلبی پائی جاتی ہیں کیونکہ جس اعلیٰ درجے کے کمال کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ اسکی ذات میں موجود ہے اور جتنے بھی نقائص تصور ہو سکتے ہیں وہ ان سے پاک و مبرّا ہے پس خداوند عالم کی صفات ثبوتی اور صفات سلبی لامحدود ہیں۔

خداوند عالم کی مشہورترین صفات:

مشہورترین صفات ثبوتیہ کو (فارسی کے) اس شعر میں ادا کیا گیا ہے:

عالم و قادر و حی است و مرید و مدرک   ہم قدیم و ازلی پس متکلم و صادق

۱: خدا ''عالم'' ہے یعنی تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

۲: خدا ''قادر'' ہے یعنی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۳: خدا ''حی'' ہے یعنی زندہ ہے اور زندہ اسے کہا جاسکتا ہے جو علم بھی رکھتا ہو اور

قدرت بھی اور چونکہ خدا ''عالم'' بھی ہے اور ''قادر'' بھی اس بناء پر وہ زندہ بھی ہے۔

۴: خدا ''مرید'' ہے یعنی صاحب ارادہ ہے اپنے کاموں میں مجبور نہیں ہے اور جو کام بھی انجام دیتا ہے اس میں مقصد اور حکمت مضمر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ کائنات میں کوئی بھی چیز اس نے بلا مقصد اور بغیر کسی فلسفے کے نہیں بنائی۔

۵: خدا ''مدرک'' ہے یعنی تمام چیزوں کو جانتا ہے اور سمجھتا ہے سب کو دیکھتا ہے تمام آوازوں کو سنتا اور ہر بات سے آگاہ و باخبر ہے۔

۶: خدا ''قدیم'' اور ''ازلی'' ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور اسکے وجود کا کوئی آغاز نہیں کیونکہ اسکی ہستی اسکی ذات سے جلوہ گر ہوئی ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ ابدی اور جاودانی ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا کیونکہ جس ذات کی ہستی خود اسکی ذات سے ہے اسکے لیئے فنا اور عدم کوئی معنی نہیں رکھتے۔

۷: خدا ''متکلم'' ہے یعنی چاہے تو ہوا میں آواز کی لہریں پیدا کر کے اپنے پیامبروں سے کلام کر سکتا ہے؛ ایسا نہیں ہے کہ خدا ''زبان، ہونٹ، اور حنجرہ رکھتا ہو''

۸: خدا ''صادق'' ہے یعنی جو کچھ کہتا ہے سچ اور عین حقیقت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ عموماً دو سبب سے بولا جاتا ہے (۱) جہالت اور نادانی کیوجہ سے (۲) یا کمزوری اور ناتوانی کے سبب سے، چونکہ خدا دانا اور توانا ہے لھذا جھوٹ اسکی ذات سے محال ہے۔

خداوند عالم کی صفات سلبیہ کو (فارسی کے) اس شعر میں جمع کیا گیا ہے۔

نه مرکب بود و جسم، نه مرئی نه محل

بی شریک است و معانی تو غنی دان خالق

۱: خدا ''مرکب'' نہیں ہے یعنی اجزاء ترکیبی سے ملکر نہیں بنا کیونکہ اسکی صورت میں

اسے اپنے اجزاء کی احتیاج ہوتی جب کہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔

۲: خدا ''جسم'' نہیں رکھتا کیونکہ جسم محدود کیا جا سکتا ہے اسمیں تغیر و تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور وہ فنا پذیر ہوتا ہے۔

۳: خدا ''مرئی'' نہیں یعنی دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اگر نظر آتا تو جسم ہوتا اور جسم ہونے کی صورت میں محدود اور فنا پذیر ہو جاتا۔

۴: خدا ''محل'' نہیں رکھتا کیونکہ اسکا جسم نہیں ہے کہ جسکی وجہ سے وہ مکان کا محتاج ہو۔

۵: خدا کا کوئی ''شریک'' نہیں ہے کیونکہ اگر اسکا کوئی شریک ہوتا تو وہ ایک محدود وجود ہوتا چونکہ دو لامحدود موجودات کا وجود کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے اس کے علاوہ اس کائنات کے قوانین میں وحدت اسکے بے مثل و یگانہ ہونے کی دلیل ہے۔

۶: خدا ''معانی'' نہیں رکھتا یعنی اسکی صفات اس کی عین ذات ہیں۔

۷: خدا 'محتاج' اور ضرورتمند نہیں ہے بلکہ غنی اور بے نیاز ہے کیونکہ علم و قدرت کے لحاظ سے ایک بے پناہ وجود کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"لیس کمثلہ شیء" (شوریٰ آیت نمبر ۱۱)

کوئی بھی چیز اسکی مانند نہیں ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) خدا کی وحدانیت اور اسکے لاشریک ہونے پر اور دلیلیں پیش کریں؟

۲) کیا آپ جانتے ہیں کہ بعض مذاہب تین خداؤں کے قائل ہیں اور بعض مذاہب کے ہاں دو خداؤں کا تصور موجود ہے؟ بتایئے وہ کون سے مذاہب ہیں؟

عدل

پہلا سبق

عدل کیا ہے؟

☆ خداوند عالم کی تمام صفات میں سے عدل کو جداگانہ، اصول دین میں سے کیوں شمار کیا جاتا ہے؟

☆ عدالت اور مساوات کے درمیان فرق۔

۱: خداوند کی تمام صفات میں سے "عدل" کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟

قبل اسکے کہ بحث کا آغاز کریں ایک نکتے کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ بزرگ علماء نے خداوند عالم کی تمام صفات میں سے صرف عدل کو اصول دین کی ایک اصل کے طور پر کیوں متعارف کروایا ہے؟

خدا عالم و قادر ہے، عادل و حکیم ہے، رحمان و رحیم ہے، خالق و رازق ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، ان تمام صفات کے ہوتے ہوئے صفت عدل کو اصول دین کی ایک جداگانہ و علیحدہ اصل کے طور پر کیوں ذکر کیا گیا ہے۔

اس اہم سوال کے جواب کیلئے چند باتیں توجہ طلب ہیں:

۱۔ عدل کی اہمیت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ بہت سی صفات خدا کی بازگشت اسی صفت

"عدل" کی طرف ہے کیونکہ کلمہ عدالت کا صحیح اور وسیع ترمعنی "ہر چیز کو اسکے مقام پر قرار دینا" ہے لھذا اس معنی کے اعتبار سے تمام صفات مثلاً حکیم، رزاق، رحمان ورحیم وغیرہ کا اطلاق وانطباق درحقیقت عدالت پر ہی ہوتا ہے۔

۲) قیامت ومعاد کا مسئلہ ہو یا پیغمبروں کی رسالت اور ائمہ کی ذمہ داریوں کا مسئلہ ان سب کا خدا کی عدالت کے مسئلہ کیساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔

۳) پروردگار کی عدالت کا مسئلہ آغاز اسلام سے ہی اختلاف کا شکار رہا ہے کیونکہ:

اہل سنت کا ایک گروہ جو "اشاعرہ" کہلایا خداوند عالم کی عدالت کا سرے سے ہی منکر ہے انکا کہنا ہے کہ خداوند عالم کی نسبت "عدالت اور ظلم" کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے اور انکی دلیل یہ ہے کہ تمام کائنات چونکہ اسکی ملکیت ہے لھذا وہ جو کام بھی کرے عین عدالت ہے حتی کہ اشاعرہ حسن عقلی اور قبح عقلی کے بھی قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری عقل اچھے اور برے کے درمیان تمیز نہیں کرسکتی، حتی کہ ہماری عقل نیک کاموں کی اچھائی اور ظلم کے برا ہونے کا حکم لگانے سے بھی قاصر ہے۔ (اور اس قسم کے دیگر بہت سے اشتباہات بھی اشاعرہ کے عقائد کا حصہ ہیں)۔

اہل سنت کا ایک دوسرا گروہ جو "معتزلہ" کہلاتا ہے اسکا اور تمام اہل تشیع کا یہ متفقہ اعتقاد ہے کہ خداوند عالم "عادل" ہے اور اس سے ظلم وستم کا صدور محال ہے۔

ان دونوں گروہوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جدا کرنے کیلئے پہلے گروہ یعنی "اشاعرہ" کو غیر عدلیہ جبکہ دوسرے گروہ کو "عدلیہ" کہا جاتا ہے کیونکہ دوسرا گروہ عدل کو اپنے مکتب کی علامت کے طور پر اصول دین میں شمار کرتا ہے۔ اہل تشیع کا شمار بھی "عدلیہ" میں کیا جاتا ہے۔

اہل تشیع نے دوسرے عدلیہ گروہ سے اپنے مکتب کے تشخص اور امتیاز کیلئے "امامت" کو بھی اصول دین کا جزء قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں پر بھی "عدل اور امامت" دونوں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے وہاں پر مراد "شیعہ امامیہ" ہوتے ہیں۔

۴) فروع دین ہمیشہ سے اصول دین کے ہمراہ ہیں، پروردگار عالم کی عدالت کی شعائیں انسانی معاشرہ میں بہت زیادہ مؤثر ہیں اور یہ عدالت اجتماعی ہی ہے کہ جسکی وجہ سے بہترین انسانی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدالت کو اصول دین کی ایک اصل کے طور پر اس لیے منتخب کیا گیا ہے تاکہ انسانوں میں عدل کو ہمیشہ زندہ رکھا جاسکے اور ہر قسم کے ظلم وستم کیخلاف جنگ جاری رہ سکے۔

جس طرح کہ پروردگار عالم کی ذات وصفات میں وحدانیت اور اسکا بطور معبود یکتا وتنہا ہونا انسانی معاشرے کے اتحاد ویگانگت کیلئے ایک نور وحدت اور انکی صفوں میں تقویت کا باعث ہے۔

خدا کے پیغمبروں اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی رہبری کا مسئلہ ہمیں بتاتا ہے کہ معاشرے کیلئے سچے اور حقیقی رہنما کتنی اہمیت رکھتے ہیں لھذا تمام کائنات کے حاکم پروردگار کی تمام صفات میں سے صرف صفت عدالت کو علیحدہ ایک اصل کے طور پر ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی معاشرے کے تمام ابعاد میں عدالت کا ہونا کتنا لازم وضروری ہے۔

اس عظیم کائنات کی خلقت اور قیامت "عدالت" سے ہے اور انسانی معاشرہ بھی عدالت کے بغیر کبھی بھی استحکام اور دوام نہیں پاسکتا۔

۲: عدالت کیا ہے؟ عدالت کے دو مختلف معانی ذکر کیئے گئے ہیں۔

۱۔ عدالت کا وسیع تر معنی تو وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی ''ہر چیز کو اسکے مناسب اور لائق مقام پر رکھنا'' بالفاظ دیگر ''ہم پلہ'' اور ''متوازن'' ہونا۔

عدالت کا یہ معنی تمام عالم خلقت، شمسی نظام میں، ایٹم کے باطن میں، وجود انسان کی عمارت میں اور تمام نباتات اور حیوانات میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے، اس بات کی طرف پیغمبر اسلام کی ایک مشہور و معروف حدیث میں بھی اشارہ کیا گیا ہے آپ نے فرمایا: "بالعدل قامت السموات و الارض" عدل ہی کی وجہ سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔

مثال کے طور پر اگر کرہ ارض کی قوت ''جاذبہ'' اور ''دافعہ'' میں تعادل و برابری قائم نہ رہے بلکہ ان میں سے ایک قوت دوسری پر حاوی آجائے یا کمزور پڑ جائے تو یا زمین سورج کے اتنی قریب ہو جائے گی کہ جل کر راکھ ہو جائے گی یا پھر اپنے مدار سے ہی باہر نکل جائے گی اور کائنات کی وسعتوں میں بھٹک کر نیست و نابود ہو جائے گی۔

عدالت کے اس معنی کو شاعر نے بھی اپنے معروف اشعار میں ذکر کیا ہے۔

عدل چه بود؟ وضع اندر موضعش

ظلم چه بود؟ وضع در ناموضعش

عدل چه بود؟ آب ده اشجار را

ظلم چه بود؟ آب دادن خار را

عدل کیا ہے؟ کسی چیز کو اسکی حیثیت کے مطابق مقام دینا۔ ظلم کیا ہے؟ کسی چیز کو اسکے شایان شان مقام سے دور کرنا۔ ثمر آور درختوں کو پانی لگانا عین عدل

اور کانٹوں کو پانی دینا عین ظلم ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ اگر پھولوں کے پودوں یا پھلوں کے درختوں کو پانی لگایا جائے تو اسے عین عدالت کہا جائے گا لیکن اگر یہی پانی بے فائدہ گھاس پھوس اور کانٹوں کو لگایا جائے تو چونکہ پانی کو غیر ضروری طور پر صرف کیا گیا ہے لہذا عین ظلم کہلائے گا۔

۲: عدالت کا دوسرا معنی ''لوگوں کے حقوق کی حفاظت و رعایت'' کرنا ہے، اس معنی کے خلاف کوئی کام ''ظلم'' کہلائے گا یعنی کسی کا حق تلف کر کے خود فائدہ اٹھانا یا کسی کے حق کو چھین کر دوسرے کو دے دینا، حتی اگر کسی کو اسکا پورا حق نہ دیا جائے بلکہ کچھ حق دینا اور کچھ نہ دینا بھی ظلم کہلائے گا۔

عدل کے ان دونوں معانی میں سے پہلا معنی ''عمومیت'' رکھتا ہے جبکہ دوسرا معنی ''خاص'' ہے۔

ہماری اس بحث ''عدل الٰہی'' کا محور اگرچہ دوسرا معنی ہے لیکن دونوں معانی خداوند عالم کی ذات سے صد در صد تعلق رکھتے ہیں۔

''عدالت خدا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ کسی کے حق کو غصب کرتا ہے اور نہ کسی کا حق کسی دوسرے کو تفویض کرتا ہے، اور نہ ہی لوگوں کے درمیان تبعیض اور عدم مساوات کا قائل ہوتا ہے، وہ ذات متعال تمام معانی کے اعتبار سے ''عادل'' ہے اور اسکی عدالت کے دلائل آیندہ بحث میں ذکر کریں گے، انشاءاللہ۔

''ظلم'' کا معنی چاہے کسی کا حق غصب کرنا ہو یا کسی کے حق کو ناحق کسی دوسرے کے سپرد کرنا ہو، کسی کو تکلیف پہچانا ہو یا ناحق کسی کو برتری دینی ہو یہ تمام معانی ذات خداوند متعال سے کسی بھی قسم کا کوئی ربط نہیں رکھتے۔

وہ ذات پاک کبھی بھی نیک کاموں کے کرنے والوں کی نیکی کو ضائع نہیں ہونے دیتی اور نہ ہی برے لوگوں کو کسی اجر کا مستحق قرار دیتی ہے، کسی کے گناہ کا مواخذہ بے گناہ سے نہیں کرتی اور نہ ہی خشک وتر پر ایک ہی حکم لگاتی ہے۔

حتی کہ اگر ایک قوم یا معاشرے میں ایک شخص کے علاوہ تمام افراد بدکار و گناہ کار ہوں تب بھی خدا اس ایک فرد کا حساب تمام قوم سے جدا رکھتا ہے اور اسے پوری قوم کے گناہوں کی سزا میں ہرگز شریک نہیں کرتا۔

''اشاعرہ'' کا یہ عقیدہ کہ ''اگر خداوند عالم تمام پیغمبروں کو دوزخ میں ڈال دے اور تمام بدکاروں، جنایت کاروں اور گناہ کاروں کو جنت میں داخل کردے تو یہ ظلم نہیں ہوگا'' یہ انتہائی بے ہودہ، شرم آور اور بے سروپا بات ہے اگر کسی شخص کی عقل تعصب وخرافات کی غلاظت سے پاک ہو تو اس بات کی گواہی دے گی کہ اشاعرہ کا یہ عقیدہ انتہائی برا اور باعث ننگ وعار ہے۔

۳) مساوات اور عدالت کے درمیان فرق

ایک ضروری بات کہ جسکا تذکرہ یہاں پر ضروری ہے یہ ہے کہ بعض اوقات ہم ''عدالت'' اور ''مساوات'' کے درمیان فرق قائم نہیں کر پاتے اور خیال کرتے ہیں کہ عدالت کا مطلب یہ ہے کہ مساوات کا خیال رکھا جائے حالانکہ ایسا نہیں ہے، عدالت میں مساوات کا ہونا ہرگز شرط نہیں ہے بلکہ عدالت کیلئے ہمیشہ استحقاق اور اولویت کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے مثلاً عدالت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک کلاس کے تمام شاگردوں کو برابر نمبر دیئے جائیں یا ایک دفتر کے دو کارکنوں کو برابر تنخواہ دی جائے بلکہ عدالت کا

مطلب یہ ہے کہ ہر شاگرد کو اسکی معلومات اور استعداد کے مطابق نمبر دیے جائیں اور ہر کارکن کو اسکے کام اور فعالیت کے مطابق تنخواہ دی جائے۔

اس عالم طبیعت میں عدالت سے مراد یہی وسیع تر معنی ہے اگر ایک ''ہیل مچھلی'' کہ جسکا وزن تقریبا ایک ٹن (۱) ہوتا ہے! کا دل ایک ''چڑیا'' کہ جو بمشکل چند گرام کی ہوتی ہے'' کے دل کے برابر ہوتا تو یہ مساوات تو کہلا سکتی تھی مگر اسے عدالت نہیں کہا جاسکتا تھا اسی طرح ایک بہت بڑے تن آور درخت کی جڑ ایک معمولی پودے کی جڑ کے برابر ہوتی تو یہ عدالت نہ ہوتی بلکہ عین ظلم ہوتا۔

ہر چیز کو اسکی صلاحیت، استعداد اور لیاقت کے مطابق اسکا حق ملنا عدالت کہلاتا ہے۔

ایک ٹن (Ton) ۲۸ من، ۱۱۲۰ سیر اور ۲۲۴۰ پونڈ (Pound) کے برابر ہوتا ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) خدا کی تمام صفات میں سے صرف عدالت کو اصول دین کی ایک اصل کیوں قرار دیا گیا ہے؟

۲) ''اشاعرہ'' کون ہیں؟ اور آپ انکے متعلق کیا جانتے ہیں؟

۳) ''عدل الٰہی'' کا عقیدہ انسانی معاشرے کیلئے کیا فوائد رکھتا ہے؟

۴) عدالت کے کتنے معانی ہیں؟ ہر ایک کی وضاحت کریں۔

۵) کیا عدالت کا معنیٰ ''مساوات'' ہے؟

دوسرا سبق

پروردگار کے عدل پر دلائل

۱: حسن وقبح عقلی:

اس اہم مسئلہ کو جاننے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ: ہماری عقل مختلف اشیاء کی اچھائی اور برائی کو ایک قابل توجہ حد تک جاننے اور درک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے (یہ وہی چیز ہے جسے دانشمند لوگ ''حسن وقبح عقلی'' کے عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں) مثلاً ہم جانتے ہیں کہ عدل وانصاف اور احسان کرنا اچھی چیزوں میں سے ہے جبکہ ظلم اور کنجوسی کرنا برائی میں سے شمار ہوتے ہیں حتی کہ دین اور مذہب کے مذکورہ بالا امور سے متعلق کوئی حکم دینے سے پہلے ہی ہمارے لیے یہ چیزیں روشن تھیں، ان بدیہی چیزوں کے علاوہ وہ باتیں کہ جنکے درک کیلئے ہماری عقل کافی نہیں ہے ضروری ہے کہ ہم الٰہی پیغمبروں ورہنماؤں کی طرف رجوع کریں۔

اسی لیے مسلمانوں کے اشاعرہ نامی گروہ کا ''حسن وقبح عقلی'' کا منکر ہونا اور تمام خوبیوں یا برائیوں کی شناخت کیلئے یہاں تک کہ عدل وظلم کے حوالے سے بھی فقط مذہب کو مرکز ومحور قرار دینا ایک بہت بڑی خطا ہے۔

اگر ہماری عقل ''خوبی'' اور ''بدی'' کے ادراک پر بھی قادر نہ ہو تو ہمیں کیسے علم ہوگا کہ خداوند عالم کسی جھوٹے شخص کو معجزہ دکھانے کی صلاحیت نہیں دیتا؟

لیکن اگر ہمیں معلوم ہو کہ دروغ گوئی ایک بری اور قابل نفرت چیز ہے اور خدا سے اسکا صادر ہونا محال ہے تو پھر واضح ہو جائے گا کہ خدا کے تمام وعدے سچے اور حق ہیں اور وہ کبھی بھی جھوٹے کی حمایت یا کاذب کو معجزہ دکھانے کی قدرت نہیں دے سکتا، اس حکم عقلی کے بعد ہم شریعت و مذہب کے احکام پر پورے اعتماد سے عمل کر سکتے ہیں۔

نتیجہ: حسن اور قبح کے عقلی ہونے کا عقیدہ دین اور مذہب کی بنیاد ہے (زیادہ دقت فرمائیں)

اب ہم عدالتِ خدا سے متعلق ادلہ پر بحث شروع کرتے ہیں لھذا درج ذیل امور پیش نظر رہیں:

۲: سرچشمہ ظلم کیا ہے؟

درج ذیل امور ظلم کے آغاز کا موجب بنتے ہیں:

۱) جھل: بعض اوقات ظالم آدمی کو واقعا معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ نہیں جانتا کہ کسی کے حق کو پامال کر رہا ہے، وہ اپنے اس فعل سے بے خبر ہے پس جہالت کیوجہ سے انسان ظالم بن سکتا ہے۔

۲) احتیاج: کبھی دوسروں کے پاس موجود چیزوں کی ضرورت اسے اس شیطانی کام پر ابھارتی ہے حالانکہ اگر اسے ضرورت نہ ہوتی تو وہ ان مواقع پر ظلم کا ارتکاب نہ کرتا۔

۳) عجز و ناتوانی: کبھی انسان چاہتا ہے کہ وہ دوسرے کے حق کو ادا کر دے مگر وہ اس حق کو ادا کرنے کی قدرت و طاقت نہیں رکھتا جسکے نتیجہ میں وہ دل سے نہ چاہتے ہوئے

بھی ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔

۴: تکبر، کینہ و بغض کا اظہار اور انتقام کی خواہش: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں عوامل موجود نہیں ہوتے مگر تکبر اور خودخواہی اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ انسان دوسروں کے حقوق کو پامال کرتا ہے، اسکی انتقام پسند اور حاسدانہ طبیعت'' اسے ظلم و ستم پر آمادہ کرتی ہے اور اسکی روح میں مخفی ''انحصار طلبی'' کی خواہش اسے جور و جفا اور ناانصافی کی طرف مائل کرتی ہے......وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ تمام بری صفات، کمزوریاں اور نواقص خداوند متعال کی ذات مقدس میں امکان پذیر نہیں ہیں وہ ہر چیز کا عالم، ہر شیء سے بے نیاز، قادر مطلق اور ہر ایک پر مہربان ہے لھذا کبھی بھی ظلم کا ارتکاب اس سے ممکن ہی نہیں ہے، وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جسکی کوئی انتہا نہیں ہے۔

ایک ایسا کمال ہے جسکی کوئی حد نہیں ہے، ایسے باکمال و پر عظمت وجود سے صرف اور صرف خیر و عدل اور رافت و رحمت کا صدور ہی ممکن ہے۔

وہ اگر بدکاروں کو سزا دیتا ہے تو حقیقتا یہ انکے ہاتھوں سے کیے گئے برے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، جیسے اگر کوئی شخص منشیات اور شراب کے استعمال کرنے کے نتیجہ میں مختلف خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"هل تجزون الا ما كنتم تعملون"

(سورہ نمل آیت ۹۰)

کیا جو کام تم انجام دیتے ہو اس کے علاوہ بھی تمھیں جزا ملے گی؟

۳: قرآن اور پروردگار کی عدالت کا مسئلہ: قرآن مجید کی آیات میں اس مسئلہ کو

بہت تاکید کیساتھ ذکر کیا گیا ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"ان اللہ لا یظلم الناس شیئاً و لکن الناس انفسھم یظلمون" (سورہ یونس آیت ۴۴)

اللہ انسانوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا لیکن انسان ہی ہیں جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

سورہ نسا میں ارشاد ہوا:

"ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ ......" (نسا آیت ۴۰)

یقیناً خداوند ایک چھوٹے ذرے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

قرآن مجید میں حساب وکتاب اور جزاوسزا کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے خداوند متعال فرماتا ہے:

"و نضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئا ......" (انبیاء آیت ۴۷)

قیامت کے دن ہم عدل کے ترازو نصب کریں گے لھذا کسی بھی شخص پر ذرا سی بھی زیادتی نہیں ہوگی۔

(اس آیہ مجیدہ میں "میزان" سے مراد "نیک و بد کو جدا کرنے کا پیمانہ" ہے نہ وہ ترازو کہ جو اس جہان میں ہمارے ہاں رائج ہیں)۔

۴) **عدل و انصاف کی طرف دعوت:** ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کی صفات خدائی صفات کا پرتو اور عکس ہونی چاہیئں اور انسانی معاشرہ میں صفات الٰہی کی شعاعیں پھیلی ہوں، اسی لیے جسطرح قرآن عدالتِ الٰہی کو بنیاد قرار دیتا ہے، اسی طرح انسانی معاشرہ میں اجتماعی

اور ہر ہر فرد میں فردی عدالت کو بھی اہمیت دیتا ہے، قرآن مجید بار بار ظلم کو معاشروں کی تباہی و بربادی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور ظالموں کے انجام کو بدترین انجام قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید بارہا جب بھی گذشتہ اقوام کا تذکرہ کرتا ہے تو اس بات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ "دیکھو گذشتہ اقوام اپنے ظلم اور فساد کی وجہ سے کس طرح عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئیں اور صفحۂ ہستی سے انکا نام ونشان مٹ گیا لھذا اپنے آپ کو ظلم وستم سے دور رکھو وگرنہ تم بھی انکی طرح عذاب میں گرفتار ہو سکتے ہو۔

قرآن مجید صراحت اور واضح انداز سے عدالت کو ایک اساسی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

"ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربی و ینھی عن الفحشاء و المنکر و البغی" (سورہ نحل آیت ۹۰)

یقیناً خدا عدل و احسان اور قرابت داروں سے نیک سلوک کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں، نافرمانیوں اور ظلم وتجاوز سے منع کرتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے ظلم کرنا ایک برا اور قبیح کام ہے اسی طرح قرآن اور اسلام کی نظر میں ظلم کو قبول کرنا اور اسے برداشت کرنا بھی غلط کام ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

"لا تظلمون و لا تظلمون" (سورہ بقرہ آیت ۲۷۹)

نہ خود ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

اصولی طور پر ظالم وستمگر کے سامنے خاموشی ظلم وستم میں اضافے اور ظالم کی اعانت کا موجب بنتی ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) کیا ہماری عقل مستقل طور پر بغیر کسی شرعی حکم کے نیکی اور برائی کا ادراک رکھتی ہے؟

۲) ظلم کا سرچشمہ کونسے امور ہیں؟ نیز خدا کے عادل ہونے پر دلیل عقلی ذکر کریں؟

۳) قرآن مجید خداوند عالم کے عادل ہونے اور ظالم نہ ہونے کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

۴) عدل اور ظلم کے مقابل انسان کا کیا وظیفہ ہے؟

۵) کیا ظلم کو برداشت کرنا اور ستم پر خاموش رہنا بھی گناہ ہے؟

تیسرا سبق

آفات وتکالیف کا فلسفہ

زمانہ قدیم سے آج تک بعض ناسمجھ اور کم فہم لوگ عدالت خدا پر بہت سے اعتراض کر رہے ہیں اور بہت سے ایسے مسائل کو مورد بحث قرار دیتے ہیں جو انکے خیال وعقیدہ کے مطابق عدالت خدا سے متصادم ہیں حتی کہ بعض اوقات وہ خدا کی عدالت کی نفی کیلئے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جو وجود خدا کے انکار پر ختم ہوتے ہیں!

ان میں سے چند دلائل درج ذیل ہیں:

بڑے بڑے حوادث مثلاً طوفان، زلزلے اور دیگر آفات سماوی ومصائب کہ نا صرف انسانوں بلکہ نباتات جمادات اور دیگر موجودات کو بھی تباہ وبرباد کردیتی ہیں اسی طرح افراد کے درمیان فرق اور تفاوت (کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی کامل الجسم ہے تو کوئی ناقص وغیرہ)۔

اگر بحث میں ہمارے مقابل مادی لوگ ہوں تو پھر "فلسفۂ آفات" کی بحث کو "خدا شناسی" کی بحث کے ضمن میں ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی اسی بحث کو "مسئلہ ..." کی بحث

کے ضمن میں ذکر کیا جاتا ہے ہم اس بحث کو یہاں پر ذکر کر رہے ہیں۔

اس بات کو جاننے کیلئے کہ یہ باطل گمان کس حد تک مضحکہ خیز اور خلاف عقل ہے آئندہ چند اسباق میں اسکا تفصیل کیساتھ جائزہ لیں گے۔

۱: محدود معلومات اور ارد گرد کے حالات کے زیر اثر فیصلے:

عام طور پر ہم سب جب کوئی فیصلہ کرنے لگتے ہیں تو ان اشیاء پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جو ہمارے ساتھ مربوط ہوتی ہیں مثال کے طور پر جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز دور ہے یا نزدیک ہے تو اس سے مراد عموماً یہ ہوتی ہے کہ ہم سے دور یا ہم سے نزدیک۔

یا فلاں شخص طاقتور یا کمزور ہے یعنی ہماری نسبت سے جسمانی یا روحی طور پر قوی ہے یا ضعیف ہے، اسی طرح وہ مسائل جنکا تعلق خیر وشر یا آفات ومصائب سے ہے انکے متعلق بھی اکثر لوگ اپنی نسبت سے ہی حکم لگاتے ہیں، مثال کے طور پر اگر باران رحمت کا نزول ہو تو ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ مجموعی طور پر اس بارش سے کیا اثرات پیدا ہوئے ہیں بلکہ ہم صرف اپنی زندگی ، گھر، کھیت کھلیان یا زیادہ سے زیادہ اپنے شہر اور علاقے کو دیکھ کر اپنا فیصلہ صادر کردیتے ہیں، اگر بارش کے اثرات اچھے اور پر ثمر ہوں تو اسے نعمت الٰہی قرار دیتے ہیں لیکن اگر اسکے اثرات مثبت نہ ہوں تو اسے مصیبت وآفت قرار دیتے ہیں اسی طرح اگر کسی پرانی فرسودہ عمارت کو تعمیر نو کی غرض سے گرادیا جائے اور اسکی گرد وغبار ہم تک پہنچ جائے تو ہم اسے مصیبت اور باعث پریشانی قرار دیتے ہیں اگر چہ اس عمارت کو گرا کر وہاں ایک ہسپتال ہی کیوں نہ تعمیر کیا جارہا ہو اور یہ کام بہت سے افراد کے مفاد میں ہو۔

ظاہری طور پر جب ہم سانپ کے زہر کو انتہائی مضر قرار دیتے ہیں تو اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ یہی زہر نا صرف سانپ کا انتہائی موثر دفاعی ذریعہ ہے بلکہ اس زہر سے ایسی حیات بخش ادویات تیار کی جاتی ہیں کہ جن سے ہزاروں انسانوں کی جان بچائی جاتی ہے۔

لھذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو اشتباہات ونقصانات سے بچائیں تو ضروری ہے کہ اپنی محدود معلومات پر بھروسہ نہ کریں اور کوئی بھی فیصلہ کرنے کیلئے اپنے ارد گرد پائی جانے والی اشیاء پر تکیہ نہ کریں بلکہ تمام جوانب کو مد نظر رکھتے ہوئے کامل معلومات کے بعد ہی کوئی حکم صادر کریں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس جہان کے حوادث زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں وہ طوفان جو آج ہمارے شہروں کو گھیرے ہوئے ہیں اور مسلسل آنے والی سیلابی بارشیں یہ سب اسی لمبی زنجیر کی کڑیاں ہیں اسی طرح وہ حوادث جو ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں انکا بھی اسی زنجیر سے تعلق ہے۔

پس ایک معمولی اور چھوٹی سی چیز کو دیکھ کر تمام چیزوں کے متعلق ایک کلی حکم لگانا اور یہ کہنا کہ ہر جگہ قطعاً ایسا ہی ہوگا یہ عقل ومنطق کے خلاف ہے۔

اس کائنات کی کسی خلقت کو صد در صد برائی اور شر قرار دینا قطعی طور پر نا قابل قبول ہے البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ایک لحاظ سے اچھی اور ایک لحاظ سے بری ہو اور اس کی اچھائی اسکی برائی اور نقصان پر غالب ہو مثلاً ممکن ہے کہ آپریشن کچھ جہات سے انتہائی تکلیف دہ ہو لیکن چونکہ اسکے فوائد بہت زیادہ ہیں تو اسے بلاشبہ باعث خیر وسلامتی قرار دیا جاتا ہے۔

مزید وضاحت کیلئے ہم زلزلے کی مثال میں دقت کرتے ہیں کہ: یہ درست ہے کہ بعض اوقات زلزلہ کچھ علاقے کو برباد کردیتا ہے لیکن اگر ہم اس زنجیر کی کڑیوں کو آپس میں ملائیں تو یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہمیں اپنا یہ فیصلہ تبدیل کرنا پڑے۔

کیا زلزلے کا تعلق صرف اس حرارت اور ان بخارات سے ہے جو زمین کے اندر ہوتے ہیں؟ یا اسکا تعلق چاند کی اس قوت جاذبہ کیساتھ ہے جو خشک و جامد زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور بعض اوقات اسے جگہ جگہ سے پھاڑ دیتی ہے؟ یا اسکا تعلق دونوں کیساتھ ہے؟ ماہرین ارضیات Geologist نے یہاں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔

وجہ جو بھی ہو وہ مثبت فوائد کا حامل ضرور ہے یعنی گر ہم اس بات کو تسلیم کرلیں کہ زمین کی حرارت ہی زلزلے کا موجب ہے تو اس حرارت کے فوائد بھی بہت ہیں مثلاً یہی حرارت باعث بنتی ہے کہ زمین میں تیل اور پٹرول ''جو کہ موجودہ دور میں انرجی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے'' کے ذخیرے وجود میں آتے ہیں اور اسی حرارت کی برکت سے زمین میں کوئلہ پیدا ہوتا ہے لھذا اس اعتبار سے زمین کی حرارت کثیر فوائد کی حامل ہے۔

اسی طرح مدوجذر جو کہ چاند کی قوت جاذبہ کا نتیجہ ہے نا صرف سمندر کے پانی کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے بلکہ اس میں موجود آبی حیات اور سمندروں کے خشک ساحل بھی بہت سے فائدے اٹھاتے ہیں کہ وہ اس سے سیراب ہوتے ہیں پھر اس میں میٹھا پانی گرتا ہے اس اعتبار سے یہ محض خیر ہے اب ہمیں یہ بات بالآخر معلوم ہوجانی چاہیے کہ محدود معلومات اور مخصوص ماحول کے مطابق کیے گئے ہمارے فیصلے اور خیالات ان اہم حقائق کو کس طرح سے مخفی کردیتے ہیں اور ہم کیوں نظام کائنات میں ظاہری طور پر صرف منفی پہلوؤں سے متعلق ہی فیصلے کرتے رہتے ہیں؟ لھذا ہم جتنا ان امور کے باہمی ارتباط اور

ان حوادث کے آپس میں قریبی تعلق پر غور کریں گے تو انکے فوائد وثمرات سے اتنے ہی آگاہ ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآن مجید ہمیں کہہ رہا ہے:

"و ما اوتیتم من العلم الا قلیلا" (اسراء آیت ۸۵)

اور تمہیں تو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔

ان تھوڑی سی معلومات کیساتھ ہمیں اتنے عجولانہ فیصلے نہیں کرنے چاہییں۔

۲: مغموم اور خبردار کرنے والے حوادث

تقریبا ہم سب ایسے بہت سے افراد کو جانتے ہیں جو نعمتوں کی فراوانی کے باعث تکبر اور خود بینی کا شکار ہوجاتے ہیں جسکی وجہ سے وہ بہت سے اہم مسائل اور اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کردیتے ہیں اور یہ بات بھی ہمارے مشاہدے میں ہے کہ جب ہم پرسکون اور آرام دہ زندگی کی آسائشوں سے بہرہ مند ہورہے ہوتے ہیں تو ایک حد تک بے پرواہ اور خواب غفلت کا شکار ہوجاتے ہیں اور اگر یہ حالت برقرار رہے تو انسان کو بدقسمتی اور مشکلات گھیر لیتی ہیں۔

بلاشک وشبہہ کچھ زندگی کے حوادث انسان کے تکبر کو ختم کرنے اور اسے خواب غفلت سے بیدار کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔

آپ نے یقینا سنا ہوگا کہ تجربہ کار ڈرائیور، بالکل صاف ستھرے، پیچ وخم سے پاک اور نشیب وفراز سے خالی راستوں کی شکایت کرتے ہیں اور ان سڑکوں کو خطرناک قرار دیتے ہیں، کیونکہ یکساں طور پر ہموار اور سیدھے راستے باعث بنتے ہیں کہ دوران سفر ڈرائیور

ست پڑ جائے اور اس پر نیند کا غلبہ ہو جائے جسکے نتیجہ میں زبردست حادثہ پیش آسکتا ہے، ان عوامل کے پیش نظر بعض ممالک میں اس قسم کی سڑکوں پر مصنوعی رکاوٹیں اور نشیب وفراز بنائے جاتے ہیں تا کہ ان خطرات کا تدارک کیا جاسکے۔

انسان کی شاہراہ زندگی بھی اسی طرح ہے، اگر انسان کی زندگی حوادث ومشکلات اور نشیب وفراز سے پاک ہو تو وہ خدا اور رسول اور اپنے وظائف اور ذمہ داریوں سے یقیناً غافل ہو جائے گا۔

ہماری اس گفتگو کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان خود ہی اپنے لیے مشکلات وحوادث تشکیل دے کیونکہ ایسی چیزیں ہمیشہ سے انسان کی زندگی میں ہیں بلکہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے حوادث کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ غفلت اور غرور کا شکار نہ ہو جو کہ خوش قسمتی اور سعادت کے ازلی دشمن ہیں اور یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ تمام حوادث اور مشکلات کا فلسفہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ جو ہم نے بیان کیا بلکہ بعض حوادث اور مشکلات اس قسم کا فلسفہ رکھتے ہیں جبکہ دیگر حوادث اور مشکلات کے متعلق ہم آئندہ اسباق میں گفتگو کریں گے انشاء اللہ۔

عظیم آسمانی کتاب قرآن مجید بھی اس فلسفہ حوادث کی طرف اشارہ کرتی ہے ارشاد خداوند ہے:

"فاخذناهم بالباساء و الضراء لعلهم يتضرعون"

(سورہ انعام آیت ۴۲)

ہم نے انہیں دردناک حادثات اور رنج میں مبتلا کیا تا کہ وہ درگاہ خداوندی کی طرف آئیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے:

۱) کن لوگوں نے آفات وتکالیف کے مسئلہ کو اعتقادی مباحث میں مورد بحث قرار دیا ہے؟

۲) آفات وتکالیف کے نمونے اور مثالیں شمار کریں۔ کیا آپکو اپنی زندگی میں ان مثالوں میں سے کسی کا سامنا کرنا پڑا ہے؟

۳) اردگرد کے حالات کے زیر اثر فیصلے سے کیا مراد ہے؟ نیز تمام اطراف کا لحاظ ''شر مطلق'' اور ''نسبۃً باعث خیر'' کی وضاحت کریں؟

۴) آیا طوفان اور زلزلے ہمیشہ باعث ضرر ونقصان ہوتے ہیں؟

۵) زندگی کے ناخوش گوار واقعات انسان کیلئے کونسے ممکنہ مثبت اثرات کے حامل ہوتے ہیں؟

چوتھا سبق

زندگی کے ناخوشگوار حادثات کا فلسفہ

ہم گذشتہ سبق میں کہہ چکے ہیں کہ بعض ظاہر بین اور نکتہ چین افراد انسانی زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حادثات، تباہ کن آفات، مشکلات اور ناکامیوں کو پروردگار عالم کی عدالت کے انکار یا پھر بعض اوقات خود ذات خدا کے وجود مقدس کے انکار کیلئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

گذشتہ بحث میں ان حوادث میں سے بعض کا جائزہ لیتے ہوئے دو موضوعات کے زیر عنوان ہم نے انکا فلسفہ پیش کیا تھا اس بحث کو اب آگے بڑھاتے ہیں۔

۳) انسان مشکلات کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔

قطعاً مشکلات پیدا نہیں کرنی چاہیئے، لیکن اس کے باوجود اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے سخت اور ناگوار حادثات ہمارے ارادے کو قوی اور ہماری توانائی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے لوہا بھٹی میں پگھلنے کے بعد مضبوط ہو جاتا ہے اسی طرح انسان

بھی حادثات کا سامنے کرنے کے بعد مضبوط اور قوی ارادے کا مالک بن جاتا ہے۔

جنگ ایک بری چیز ہے، لیکن بعض اوقات ایک طویل اور گھمسان کی جنگ کسی ملت کی صلاحیتوں میں اضافے کا باعث بنتی ہے ان کے تفرقہ کو وحدت میں تبدیل کرتی ہے اور ان کی پسماندگی کا بڑی تیزی کے ساتھ خاتمہ کرتی ہے، ایک معروف مغربی مورخ کہتا ہے کہ تاریخی طور پر دنیا کے کسی بھی نقطہ میں اگر کوئی روشن تمدن پایا جاتا ہے تو در حقیقت اس ملت اور ملک پر کوئی نہ کوئی بہت بڑی استعماری طاقت حملہ آور ہوتی ہے کہ جس کے نتیجہ میں وہ مملکت اور اس کے سوئے ہوئے افراد بیدار ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے آمادہ اور تیار کر لیتے ہیں!

البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی کے تلخ حوادث کے مقابلہ میں تمام افراد اور ہر ملت کا عکس العمل ایک جیسا ہو بہت سے گروہ صرف اس لیے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو کمزور اور ناتواں سمجھنے لگتے ہیں۔

لیکن وہ افراد جن کیلئے حالات سازگار ہوتے ہیں وہ اس قسم کے حوادث کا مقابلہ کرنے کیلئے حرکت میں آجاتے ہیں اور انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی کمزوری اور کم ہمتی کی تیزی کے ساتھ اصلاح کر لیتے ہیں۔

پس کیونکہ لوگ اس قسم کے حوادث اور مشکلات کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتے لھذا وہ ان کے منفی اور تلخ آثار کو تو درک کرتے ہیں لیکن مثبت اور موافق آثار کو نہیں دیکھ پاتے، ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر رہے کہ انسانی زندگی کے تمام تلخ حادثات اس قسم کے آثار رکھتے ہیں لیکن بہت سے حادثات مثبت آثار بھی رکھتے ہیں۔

اگر آپ دنیا کے باکمال لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً یہ

تمام لوگ مشکلات اور تکالیف سے گذر کر ہی باکمال بنے ہیں جبکہ ایسے افراد کم نظر آئیں گے کہ جنھوں نے آرام و ناز میں پرورش پائی ہو اور کسی بڑے مقام تک پہنچ کر باکمال لوگوں کی صف میں شامل ہوئے ہوں۔

فوج کے سپہ سالار وہ ہوتے ہیں کہ جنھوں نے طویل اور سخت جنگوں کے میدان دیکھے ہوں، اقتصادیات کے ماہر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اقتصادی بحرانوں کا سامنا کر چکے ہوں اور بڑے سیاستدان ان لوگوں کو سمجھا جاتا ہے کہ جو مشکل اور سخت سیاسی مسائل کا سامنا کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں خلاصہ کلام یہ کہ: مشکلات اور تکالیف اپنی آغوش میں انسان کی پرورش کرتی ہیں۔

قرآن مجید میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

"فعسی ان تکرھو شیئا و یجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً" (سورہ نساء آیت ۱۹)

ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں تو پسند نہ ہو مگر اللہ اس میں بہت سی خوبیاں پیدا کردے۔

۴) مشکلات خدا کی طرف رجوع کا ذریعہ ہیں۔

گذشتہ ابحاث میں ہم نے مطالعہ کیا ہے کہ ہمارے وجود کا ہر جزء ایک مقصد اور غرض رکھتا ہے ہماری آنکھیں، کان، دل، دماغ اور اعصاب کسی نہ کسی خاص مقصد اور غرض کے تحت بنائے گئے ہیں حتی کہ ہمارے ہاتھوں کی لکیریں اور ہماری انگلیوں کے خطوط بھی ایک خاص فلسفہ رکھتے ہیں لھذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارا تمام وجود بغیر کسی مقصد اور فلسفہ کے بنایا

گیا ہو اس کے علاوہ گذشتہ ابحاث میں ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ یہ تمام اغراض و مقاصد صرف اور صرف ایک انسان کامل بنانے کیلئے ہیں پس اس تکامل تک رسائی حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ دقیق قسم کے تعلیمی اور تربیتی پروگرام تشکیل دیے جائیں کہ جو پورے انسانی وجود کو شامل ہو یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو پاک توحید پرست فطرت دینے کے ساتھ ساتھ اسکی رہنمائی کیلئے عظیم الشان پیغمبروں کو آسمانی کتابوں سمیت بھیجا ہے۔

اسی مقصد کی تکمیل کیلئے کبھی کبھی اسے اس کے گناہوں اور سرکشی کے برے نتائج سے دوچار کرتا ہے کہ وہ فرامین پروردگار کی مخالفت کی وجہ سے زندگی کی مشکلات کا سامنا کرے اور ان برے نتائج سے آشنا ہونے کے بعد اپنا رخ خدا کی طرف موڑے اس مقام پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سی مشکلات و تکالیف اور ناگوار حادثات درحقیقت خدا کی طرف سے رحمت اور نعمت کا باعث بنتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید بھی فرماتا ہے:

آیہ مبارکہ:

"ظھر الفساد فی البرّ و البحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون" (سورہ روم آیت ۴۱)

خود لوگوں کے اپنے اعمال کے باعث خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا تا کہ انھیں ان کے بعض اعمال کا ذائقہ چکھایا جائے شاید یہ لوگ پلٹ آئیں۔

اس تمام گفتگو کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصائب و مشکلات و تکالیف کو

محض برائی سمجھنا اور اسے آفت و آسیب قرار دیتے ہوئے عدالت الٰہی کے خلاف شمار کرنا عقل کی منطق اور دلیل سے دور ہے کیونکہ ہم اس مسئلہ میں جتنی بھی گہری فکر کریں گے اور اس کی باریکیوں میں جائیں گے تو ہمیں اس کے فلسفہ اور حکمت کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوں گی۔

سوچیے اور جواب دیجیے؟

۱) ہماری خلقت کا مقصد کیا ہے اور ہم کس طریقے سے اس مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں؟

۲) انسان کس طرح مشکلات کی وجہ سے قوی اور باہمت ہوتا ہے؟

۳) کیا آپ نے ایسے افراد کو دیکھا ہے یا ان کے متعلق تاریخ میں پڑھا ہے کہ جنہوں نے مشکلات اور تکالیف کی آغوش میں پرورش پائی ہو اور کسی بلند و بالا مقام پر پہنچے ہوں؟ مکمل وضاحت کیجئے؟

۴) قرآن مجید ہمارے گناہوں کے عکس العمل کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

۵) وہ کون سے افراد ہیں جو تلخ اور ناگوار حادثات کے نتیجہ میں مثبت رائے قائم کرتے ہیں اور وہ کون سے افراد ہیں جو منفی رائے اختیار کرتے ہیں؟

پانچواں درس

آفات ومشکلات کے فلسفہ کے بارے میں

جہاں تک ناگوار حادثات اور آفات کی مشکل کا تعلق ہے یہ بہت سے بحث توحید کا مطالعہ کرنے والوں کے لیئے قابل غور مشکل ہے لھذا ہم مجبور ہیں کہ دوبارہ ایک اور انداز سے اسکا تجزیہ کریں اور اسی آفات کی بحث کو آگے بڑھائیں:

۵) مشکلات اور نشیب وفراز زندگی کو روح عطا کرتے ہیں

شاید بعض افراد کیلیے اس مسئلے کا ادراک مشکل ہو کہ اگر خدا کی عنایات اور نعمتیں دائمی اور پے در پے ہوں تو اپنی قدر وقیمت اور اہمیت کھو دیتی ہیں۔

آج یہ ثابت ہو چکا کہ اگر ایک چیز کو ایک کمرے کے درمیان میں رکھ دیا جائے اورا اس کے چاروں طرف سے اس پر طاقتور قسم کے آلات کے ذریعے روشنی ڈالی جائے اور وہ چیز اور کمرہ بھی مکمل طور پر صاف اور دائرے کی شکل میں ہوں تو اس چیز کا ہرگز مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔

کیونکہ ہمیشہ جسم کا مشاہدہ اس وقت کیا جاسکتا ہے کہ جب روشنی کی وجہ سے اس کا سایہ

پیدا ہو ورنہ سایہ کی عدم موجودگی میں اس کا مشاہدہ ممکن نہیں ہے۔

زندگی کی نعمتوں کی قدر وقیمت بھی مشکلات کی کمی اور زیادتی کے سایوں کے بغیر قابل مشاہدہ نہیں ہے اگر تمام عمر انسان امراض سے بچا رہے تو وہ صحت وسلامتی کی لذت کا احساس نہیں کرسکتا صرف ایک رات کے سخت بخار اور شدید سر درد کے بعد جب انسان صحت یاب ہوکر سلامتی کا شیرین ذائقہ چکھتا ہے کہ پھر جب بھی اسے اپنی وہ بیماری والی رات یاد آتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ صحت سلامتی جیسا کیا گوہر بے مثال اسکے پاس ہے۔

درحقیقت زندگی میں یکسانیت ''حتی کہ معیار زندگی کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو'' انسان کو تھکاوٹ کا احساس دیتے ہوئے بے روح کردینے والی ہے۔ بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جو افراد ایک اعلی، معیاری اور ہر قسم کے رنج ومشکلات سے خالی زندگی گذارتے ہیں وہ یا تو خودکشی کرلیتے ہیں یا ہمیشہ اپنی زندگی سے شاکی رہتے ہیں، آپ کو کوئی بھی ایسا معمار نہیں ملے گا جو باذوق ہوتے ہوئے ایک بہت بڑے اور خوبصورت ہال کی دیواروں کو جیل کی دیواروں کی طرح صاف اور ایک جیسی بنادے بلکہ وہ ہال کی دیوار کو نشیب وفراز اور پیچ وخم کے ساتھ ایک خوبصورت شکل میں تعمیر کرے گا۔

یہ دنیا اتنی خوبصورت کیوں ہے؟ پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگل اور سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے چھوٹے بڑے درختوں کے درمیان سے گذرتی ہوئیں نھروں کا منظر اس قدر دلکش اور خوشنما کیوں ہے؟ اس کی سب سے بڑی دلیل یکسانیت کا نہ ہونا ہے۔

نظام شمسی اور شب وروز کی آمد ورفت کہ جس کا تذکرہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں

ہوا ہے انسانی زندگی سے یکسانیت کو دور کرنے کیلئے ہے کیونکہ اگر سورج آسمان کے ایک ہی گوشے میں رہے اور ہمیشہ زمین کے ایک ہی حصہ پر اپنی ضوء افشانی کرتا رہے اور اس میں کوئی بھی تبدیلی واقع نہ ہو اور نہ ہی اس خطے پر رات کا طلائی پردہ آئے تو ایسی صورت میں دیگر اشکالات کے علاوہ تمام انسان بہت کم مدت میں اکتا جائیں گے۔

لھذا ان تمام باتوں کے پیش نظر ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ کم از کم زندگی کی مشکلات اور حوادث کے ایک حصے کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ باقی زندگی کو نہ صرف روح عطا کرتا ہے بلکہ اسے شیریں اور قابل تحمل بھی بنا دیتا ہے، نعمتوں کی قدر و قیمت کو آشکار کرتا ہے اور انسان کیلئے یہ امکان پیدا کرتا ہے کہ وہ ان نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہو سکے۔

۶۔ خود ساختہ مشکلات!

ہم اس بحث کے آخری مرحلہ میں جس نکتے کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ بہت سے افراد مصائب و مشکلات اور ناگوار حادثات کا تجزیہ کرتے وقت غلطی کرتے ہیں، ظالم وستمگر انسانوں کے ہاتھوں واقع ہونے والے ظلم اور زیادتیوں کو نظام کائنات کی بے عدالتی سمجھتے ہیں اور انسانی کاموں میں بے نظمی کو نظام کائنات کی بے نظمی کی طرف نسبت دیتے ہیں۔

مثلاً کبھی اعتراض کرتے ہیں کہ "چرا ہر چہ سنگ است برای پای لنگ است؟ (یعنی جو بھی پتھر ہے وہ لنگڑے کے پاوں کیلئے ہے) اور کیوں زلزلہ شہروں میں کم نقصان کرتا ہے جبکہ دیہاتوں میں زیادہ لوگوں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے اور بہت سے لوگ بے گھر

ہو جاتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے اور یہ کونسی عدالت ہے؟ اگر مصیبت کو تقسیم کرنا مقصود ہے تو پھر کیوں برابر تقسیم نہیں ہوتی دردناک اور سخت قسم کے حوادث کا شکار ہمیشہ کمزور و ناتوان لوگ ہی کیوں ہوتے ہیں؟ متعدی بیماریوں کا شکار بھی یہی لوگ کیوں بنتے ہیں ؟

یہ لوگ اس بات سے غافل ہوتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں خدا کی خلقت اور عدالت سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں بلکہ انسانوں کے ہی ایک دوسرے پر کیے جانے والے ظلم وزیادتیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

اگر دیہاتی لوگ شہریوں کے ظلم اور زیادتیوں کی وجہ سے نعمتوں اور آسائشوں سے محروم اور فقر وفاقہ کا شکار نہ ہوتے تو وہ بھی اپنے لیے محکم اور مضبوط مکان بنا سکتے تھے اور زلزلے کی تباہیوں سے بچ سکتے تھے۔

جب دیہاتیوں کے گھر گارے یا پتھر اور لکڑی اور بعض اوقات گچ اور سیمنٹ کے بغیر انتہائی سادہ طریقے سے تعمیر کیے جاتے ہیں تو نتیجہ میں وہ شدید آندھی اور طوفان یا پھر زمین کی ہلکی سی لرزش کی وجہ سے گر جاتے ہیں پھر ان غرباء کی حالت کے بہتر ہونے کی امید کیسے کی جا سکتی ہے لیکن اس چیز کا خدا کے کاموں سے کیا تعلق ہے؟

ہمیں اس عیب جو شاعر کی طرح یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ایک کو ہزاروں نعمتوں سے نوازا ہے اور دوسرے کو ذلت اور رسوائی کا نشانہ بنایا ہے ایک کو محل عطا کیا ہے اور دوسرے کو جھونپڑی!

ضروری ہے کہ اس تنقید کا رخ معاشرہ کے غیر موضوع اور غلط نظام کی طرف موڑا جائے ہمیں چاہیے کہ ہم اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور اس اجتماعی بے عدالتی کو ختم کردیں، محرومیت اور فقر وتنگدستی کا مقابلہ کریں اور محکوم

دیں تا کہ اس قسم کی برائیاں پیدا ہی نہ ہوں۔

اگر تمام افراد کو ضرورت کی حد تک غذا اور صحت کی بنیادی سہولتوں سے بہرہ مند کیا جائے تو وہ متعدی بیماریوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور اور قوی ہو جائیں گے۔

لیکن جب اجتماعی نظام کی غلط وضعیت کی وجہ سے ایک حاکم بعض افراد کیلئے اتنی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کردے کہ ان کے کتے اور گھریلو بلّیاں بھی ڈاکٹر، ہسپتال اور دواء کی سہولیات رکھتی ہوں لیکن باقی لوگ اپنے نوزاد بچوں کی پرورش کیلئے بنیادی طبعی سہولتوں سے بھی محروم ہوں تو پھر کثرت سے اس قسم کے ناگوار مناظر کا مشاہدہ کیا جاتا ہے لھذا اس مقام پر بجائے اس کے کہ ہم خدا پر اعتراض کریں ہمیں اپنی اصلاح کی ضرورت ہے۔

ضروری ہے کہ ظالم سے کہیں ظلم نہ کرو۔

ضروری ہے کہ مظلوم سے کہیں کہ ظلم کو برداشت نہ کرو!

اور ضروری ہے کہ ہم کوشش کریں کہ ایک تہذیب وتمدن کے تمام افراد کم از کم بنیادی صحت کی سہولتوں ہسپتال، اچھی خوراک، پرسکون گھر، مناسب تعلیم اور ماحول سے بہرہ مند ہوسکیں۔

مختصر یہ کہ ہمیں اپنے گناہوں کا بوجھ نظام خلقت کی گردن پر نہیں ڈالنا چاہیے۔

ہماری اس قسم کی زندگی خود ساختہ ہے نا کہ خدا کی عطا کردہ ہے اور خدا نے اس غیر عادلانہ نظام پر عمل کرنے کا ہمیں کب حکم دیا ہے؟ البتہ خدا نے ہمیں آزاد پیدا کیا ہے کیونکہ آزادی ہمارے تکامل اور ترقی کا راز ہے لیکن ہم خود ہی اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسروں پر ظلم وستم کرتے ہیں جسکی وجہ سے معاشرہ ایک نامطلوب صورت اختیار کر جاتا ہے۔

لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ اس قسم کی غلط فہمی کا شکار بہت زیادہ لوگ ہوئے ہیں حتی کہ بعض معروف شعراء کے اشعار میں بھی اس بات کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

قرآن مجید ایک بہت ہی مختصر اور پر معنی جملہ میں فرماتا ہے۔

"ان اللہ لا یظلم الناس شیئا و لکن الناس انفسھم یظلمون" (سورہ یونس آیہ ۴۴)

اللہ یقیناً لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ لوگ ہیں جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

اسی ترتیب کے ساتھ ہم مصائب ومشکلات کی بحث کو تمام کرتے ہیں اگر چہ اس بحث کے متعلق بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن ایک مختصر اور مشکل بحث کے متعلق اتنی ہی گفتگو کافی ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) آفات و مشکلات کے فلسفہ کی بحث کو ہم نے تین درسوں میں کیوں بیان کیا ہے؟

۲) زندگی میں یکسانیت کے کون سے برے اثرات ہیں؟ اور کیا آپ نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو پر تعیش زندگی کے باوجود غمگین ہو؟

۳) اس کائنات میں نور وظلمت کے نظام کا فلسفہ کیا ہے؟

۴) آیا اس دنیا کے تمام مصائب اور مشکلات کا تعلق نظام خلقت سے ہے یا ہمارا بھی اس میں کوئی نہ کوئی کردار ہے؟

۵) کیا اجتماعی مشکلات کو ختم کرنے کیلئے ہمارے پاس کوئی صحیح راستہ ہے؟ مستضعفین کے بارے میں ہمارا شرعی وظیفہ اور ذمہ داری کیا ہے؟

چھٹا سبق

مسئلہ جبر واختیار

پروردگار عالم کی عدالت کے مسئلہ سے مربوط اور نزدیک ترین مسئلہ "جبر واختیار" ہے، کیونکہ جبر کے عقیدہ کے قائل لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انسان اپنے ہر عمل، روش اور گفتگو میں بااختیار نہیں ہے، بلکہ اس کے جسم کی تمام حرکات ایک ماشین کے پرزوں کی مانند ہیں۔ جس طرح ایک ماشین کے تمام پرزے جبری طور پر حرکات کرتے ہیں اسی طرح انسان بھی اپنی تمام حرکات میں مجبور ہے۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جبر واختیار کا عقیدہ عدل الٰہی کے مسئلہ سے کیا مناسبت رکھتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مذہب اشاعرہ کے پیروکاروں "کہ جن کا تعارف ہم گذشتہ اسباق میں پیش کر چکے ہیں اور وہ حسن وقبح عقلی کے منکر ہوئے ہیں" نے عقیدہ جبر کو اختیار کیا ہے اور عدالت الٰہی کا انکار کیا ہے کیونکہ جبر کا عقیدہ قبول کرنے کے بعد عدالت الٰہی کے مسئلہ کے بارے میں بحث کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس بحث کو مزید واضح کرنے کیلئے ہم بعض موضوعات کے متعلق دقیق بحث کرتے ہیں:

۱) عقیدہ جبر کا سرچشمہ

ہر شخص اپنے وجود کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی بھی ارادہ کرنے میں آزاد ہے مثلاً وہ اپنے فلاں دوست کی مالی مدد کرے یا نہ، یا پیاس کی حالت میں اپنے سامنے رکھے ہوئے پانی کو پیئے یا نہ پیئے، یا فلاں شخص نے اس کے بارے میں زیادتی کی ہے وہ اگر چاہے تو اس کو معاف کردے یا اسے معاف نہ کرے یا ایک ایسا شخص کہ جس کے ہاتھ بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کانپتے ہیں اور وہ شخص کہ جس کے ہاتھ ارادہ کے ساتھ حرکت میں آتے ہیں ان دونوں کے درمیان ہی وہ فرق قائم کرسکتا ہے۔

اب جبکہ انسانوں کے درمیان یہ عمومی احساس پایا جاتا ہے کہ وہ ارادہ کرنے میں آزاد ہیں تو پھر لوگوں کے ایک گروہ نے جبر کے عقیدے کو کیوں اختیار کیا ہے؟

البتہ اس مسئلہ کے متعلق مختلف دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور ہم بھی ایک اہم دلیل کو یہاں پر پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ انسان دیکھتا ہے کہ ماحول کے لوگوں پر اثرات ہوتے ہیں اسی طرح تربیت، نصیحت، ہدایت وتبلیغ اور عمومی رسم ورواج بھی بلاشبہ انسانی فکر اور روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس کی مالی واقتصادی حالت بھی اس کی بعض حرکات کا باعث بنتی ہے۔ وراثت کے عامل کا مؤثر ہونا بھی ناقابل انکار ہے۔

یہ تمام امور اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ با اختیار نہیں ہے بلکہ بہت سے اندرونی وبیرونی عوامل اکٹھے ہوکر ہمیں ابھارتے ہیں کہ ہم کچھ کرنے کیلئے تیار ہوجاتے ہیں اگر یہ عوامل نہ ہوتے تو بہت سے کام ہم سے سرزد ہی نہ ہوتے، ان تمام امور کو ہم ماحول کا جبر، اقتصادی شرائط کا جبر، تعلیم وتربیت کا جبر اور وراثتی جبر، کے ناموں

سے تعبیر کرسکتے ہیں ان عوامل میں سے ”مکتب جبر“ فلاسفہ کی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہے۔

۲) جبر کے معتقد افراد کی غلط فہمی کی اصل وجہ

یہ ہے کہ وہ غور وفکر کرتے وقت ایک بنیادی نکتہ کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور وہ نکتہ یہ ہے کہ بحث ”مختلف اور ناقص اسباب“ میں نہیں ہے بلکہ بحث ”کامل اسباب“ میں ہے یا ایسے کہہ سکتے ہیں کہ: کوئی بھی شخص ”ماحول رواج“ اور ”اقتصادی عوامل“ کا انسانی افعال اور اسکی فکر میں اثر انداز ہونے کا انکار نہیں کرسکتا، اصل بحث اس میں ہے کہ ”ان تمام اسباب کے باوجود پھر بھی آخری فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہوتا ہے۔

کیونکہ ہم واضح طور پر احساس کرتے ہیں حتی کہ ایک غلط اور طاغوتی نظام (جیسے شہنشاہی نظام) میں انحراف کے بہت سے مواقع موجود تھے مگر ہم مجبور نہیں تھے کہ منحرف ہوجائیں، اسی نظام ومعاشرے میں ہمارے لیے یہ ممکن تھا کہ ہم ”رشوت“ نہ لیں، فساد اور فحاشی کے مراکز کا رخ نہ کریں اور بے قید وبند اور لاابالی نہ ہوں۔

لھذا ان مواقع کو ”علت تامہ“ سے الگ کرنا ضروری ہے یہی دلیل ہے کہ بہت سے افراد ”غیر مہذب خاندان“ یا ”پست ماحول“ میں پرورش پاتے ہیں یا وراثت کے اعتبار سے غیر مناسب مسائل کا سامنا کرتے ہیں لیکن اسکے باوجود اپنے لئے الگ اور صحیح راہ کا انتخاب کرتے ہیں یہاں تک کہ بہت سے یہی افراد اس قسم کے ماحول اور معاشرے کے خلاف کام کرتے ہوئے اسے بدل کر رکھ دیتے ہیں، ورنہ اگر یہ ضروری ہو کہ ”تمام انسان ماحول، کلچر، اور زمانے کی ہوا کے تابع ہوتے تو دنیا میں کبھی بھی کوئی انقلاب برپا نہ ہوسکتا اور تمام افراد ماحول کی اتباع کرتے ہوئے نیا اور

ہوتے۔

مذکورہ بالا تمام گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ تمام مذکورہ عوامل میں سے کوئی بھی عامل ''تقدیر ساز'' نہیں ہے بلکہ صرف مواقع فراہم کرتا ہے، اپنا نصیب دراصل انسان کا اپنا ارادہ اور مستحکم عزم بناتا ہے۔

اور یہ بات ایسے ہی ہے کہ ہم ایک انتہائی گرم موسم میں حکم خدا کی اطاعت کرتے ہوئے روزہ رکھنے کا عزم کریں جبکہ ہمارے وجود کے تمام ذرات پانی کی تمنا رکھتے ہوں لیکن ہم اطاعت خدا میں انکی پرواہ تک نہ کریں جبکہ دوسرا شخص ممکن ہے کہ حکم خدا کو سننے کے باوجود روزہ نہ رکھے۔

نتیجہ یہ کہ: ان تمام ''اسباب'' کے باوجود انسان کے پاس عزم وارادہ جیسی چیزیں ہیں کہ وہ انکے ذریعے اپنا مقدر خود بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۳) سچ تو یہ ہے کہ ''جبر واختیار کا مسئلہ'' روز اول سے آج تک کثرت سے غلط فائدہ اٹھانے کا باعث بنتا رہا ہے۔ اطراف کے اور قسم کے اسباب کا سلسلہ ''جبر'' اور انسان کے ارادہ کی آزادی کی ''نفی'' کے عقیدہ کی تقویت کیلئے موثر کردار ادا کرتا رہا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

الف: سیاسی اسباب

بہت سے جابر وستمگر حکام، ضروریات سے محروم اور مظلوم لوگوں کے دلوں سے انقلاب کے شعلہ کو بجھانے اور اپنی ناپسندیدہ اور قابل نفرت حکومت کو دوام بخشنے کیلئے ہمیشہ اس فکر کو اجاگر کرنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ ہم بے اختیار ہیں، ہماری تقدیر

ہماری قسمت کا تاریخی جبر ہمارے حال کا فیصلہ کرنے والا ہے اگر کوئی امیر ہے یا کوئی غربت کی چکی میں پس رہا ہے تو یہ قضا وقدر کے حکم یا تاریخ کے جبر کی وجہ سے ہے!

واضح ہے کہ اس قسم کا طرز فکر کس حد تک انقلابی افکار کو بے حس کر سکتا ہے؟ اور انکی آمرانہ سیاست میں انکی مدد کر سکتا ہے؟ حالانکہ عقلی وشرعی طور پر ہماری ''تقدیر'' خود ہمارے ہاتھوں میں ہے اور وہ قضا وقدر جسکا معنیٰ ''جبر'' کیا جاتا ہے اسکا بالکل وجود نہیں ہے الہی قضا و قدر ہماری حرکات خواہشات، ارادہ، ایمان، جستجو اور کوشش کے عین مطابق ہے۔

ب: نفسیاتی اسباب

اکثر سست، بے کار اور نکمے لوگ اپنی زندگی میں ناکام ونامراد رہتے ہیں، اور ہرگز اس بات کو قبول نہیں کرتے کہ انکی سستی اور خطائیں انکی ناکامی وشکست کا باعث بنی ہیں، لھذا اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے ''مکتب جبر'' کے دامن کو پکڑ لیتے ہیں اور اپنی قسمت کو اپنی ناکامیوں کی وجہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہم کیا کریں ہماری قسمت تو روز اول سے ہی سیاہی کیساتھ لکھی گئی ہے اور اسے زمزم یا حوض کوثر کے پانی سے بھی سفیدی میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہم با استعداد بھی ہیں اور ہم نے کوشش بھی کی ہے مگر افسوس کہ ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا!

اجتماعی اسباب

بعض افراد چاہتے ہیں کہ وہ آزادی کیساتھ ہوا وہوس کی راہوں پر چلیں اور ہر وہ گناہ

جو انکی حیوانی خواہشات کے مطابق ہو اسکا ارتکاب کریں اسکے باوجود وہ اپنے آپ کو قانع رکھتے ہیں کہ وہ گناہ گار نہیں ہیں اور معاشرے میں بھی اس قسم کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔

لھذا وہ "عقیدہ جبر" کی پناہ تلاش کرتے ہیں اور اپنی ہوس بازی کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تمام کام ہم سے اس وجہ سے صادر ہوئے ہیں کہ ہم اپنے کاموں میں با اختیار نہیں ہیں!

لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ انکا یہ عقیدہ جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے حتی کہ اس قسم کی باتیں کرنے والے لوگ خود بھی جانتے ہیں کہ انکی تمام باتیں اور یہ عذر بے بنیاد ہیں لیکن "عارضی لذت" اور جلد ختم ہونے والے منافع انکی عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور انکو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اس حقیقت کا برسر عام اقرار کرسکیں۔

پس ضروری ہے کہ معاشرے کو اس جبری طرز تفکر، اور قسمت وتقدیر کو جبر کا نتیجہ قرار دینے کے عقیدے سے پاک کرنے کیلئے زبردست کوشش کی جائے کیونکہ (درحقیقت) اس قسم کا عقیدہ "سامراجی قوتوں کا بہت بڑا معاون، جھوٹی شکستوں کیلئے مختلف بہانوں کا وسیلہ اور معاشرے کی آلودگی بڑھانے کا بہت بڑا سبب ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) "جبر" اور "اختیار" کے نظریہ کا فرق بیان کریں؟

۲) جبر کا عقیدہ رکھنے والے افراد کس دلیل پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں؟

۳) ماحول، کلچر اور وراثت کے اثرات کا جواب کیا ہے؟

۴) سیاسی، نفسیاتی اور اجتماعی عوامل جو کہ عقیدہ جبر کے مطابق انسان کو درپیش ہیں۔ انکی وضاحت کریں؟

۵) ان عوامل کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ساتواں سبق

ارادہ اور اختیار کی آزادی پر واضح ترین دلیل

۱۔انسان کا ضمیر (عقیدہ) جبر کی نفی کرتا ہے۔

اگر چہ فلاسفہ اور ماہرین علم کلام نے انسان کے ارادہ میں آزاد ہونے کے مسئلہ میں بہت سے مختلف دلائل پیش کیے ہیں مگر ہم اختصار کے پیش نظر ان دلائل میں سے صرف ایک واضح ترین دلیل ''انسان کا عمومی ضمیر (وہ باطنی قوت جو اچھائی اور برائی میں بخوبی تمیز کرتی ہے) کو پیش کرتے ہیں۔

ہم ہر چیز کا انکار کرسکتے ہیں مگر اس بات کا انکار نہیں کرسکتے کہ ہر معاشرے میں (چاہے وہ خدا پرستوں کا معاشرہ ہو یا مادہ پرستوں کا، مشرقی ہو یا مغربی، قدیم ہو یا جدید، ثروتمند ہو یا غریب، ترقی یافتہ ہو یا غیر ترقی یافتہ اور ہر قسم کی تہذیب وتمدن کے افراد اس بات پر متفق ہیں) ایک ایسے ''قانون'' کا ہونا ضروری ہے کہ جو معاشرے پر حاکم ہو اور لوگ اس قانون کی پیروی میں اپنی ذمہ داری کا احساس کریں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے افراد کو سزا دی جاسکے۔

مختصر یہ کہ قانون کی حاکیت، لوگوں کی طرف سے قانون کا احترام، اور خلاف ورزی

کرنے والوں کو اسکی سزا، جیسے مسائل پر تمام جہان کے عقلاء متفق ہیں البتہ صرف وحشی اور تہذیب سے دور اقوام ان تینوں باتوں کو قبول نہیں کرتیں۔

یہ دلیل کہ جسے ہم نے ''تمام دنیا کے افراد کا عمومی ضمیر'' کے نام سے تعبیر کیا ہے انسان کے اپنے ارادہ میں آزاد ہونے پر سب سے واضح دلیل ہے۔

یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے ارادے اور اعمال میں تو کسی بھی قسم کا اختیار نہیں رکھتا لیکن قوانین کا احترام اسکے لئے ضروری ہے، اور قوانین کی خلاف ورزی پر اس سے جواب طلبی بھی ضروری ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا؟

اور خلاف ورزی ثابت ہونے پر کبھی اسکو جیل کی سزا اور کبھی پھانسی کی سزا کا سامنا بھی کرنا پڑے۔

اسکی مثال ایسے ہی ہے جیسے پہاڑوں سے پھسل کر پتھر سڑک پر آجائے اور سفر کرنے والوں کی ہلاکت کا باعث بن جائے اور ہم اس پتھر کو عدالت میں لاکر اسکے خلاف مقدمہ قائم کریں۔

یہ درست ہے کہ ظاہری طور پر ایک انسان اور پتھر کے ٹکڑے کے درمیان فرق ہے لیکن اگر ہم کہیں کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے تو پھر یہ فرق بالکل ختم ہوجاتا ہے جسکے نتیجہ میں انسان اور پتھر جبری عوامل کے تابع ہوجاتے ہیں پتھر قانون جاذبہ کے تحت سڑک کے وسط میں آگرتا ہے، اور انسان جبری عوامل کی وجہ سے جنایت کار، قاتل اور قانون کا مخالف بن جاتا ہے۔

عقیدہ جبر کے قائل ہونے کی صورت میں ان کے درمیان کسی بھی قسم کا فرق نہیں ہے اور چونکہ کسی نے بھی اپنے ارادے سے فعل انجام نہیں دیا لہٰذا ایک کو [illegible]

میں کھڑا کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا کیسے جائز ہوگا؟!

ہم دوراہے پر کھڑے ہیں: یا تو تمام افراد کے عمومی وجدان کو غلط اور خطاء قرار دیں اور تمام قوانین، عدالتوں، مجرمین کو دی جانے والی سزاؤں کو عبث اور بیہودہ بلکہ ظالمانہ کام قرار دیں یا پھر ''عقیدہ جبر'' کا انکار کریں۔

بلاشبہ دوسری بات کو ترجیح حاصل ہے۔

قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ جبر کا عقیدہ رکھنے والے افراد و مفکرین جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو عملی طور پر وہ ''ارادہ کی آزادی'' کے عقیدہ پر عمل پیراہ ہوتے ہیں!

کیونکہ اگر کوئی شخص انکے حقوق کو پامال کرتا ہے یا انکو تکلیف پہنچاتا ہے تو اسکو سزا کا مستحق تصور کرتے ہیں اور اسکی شکایت عدالت میں جاکر کرتے ہیں اور جب تک اسکو کوئی سزا نہ دی جائے آرام وچین سے نہیں بیٹھتے پس اگر انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے تو پھر یہ شور وغوغا اور داد وفریاد کیوں کرتے ہیں؟!

بہر حال عقلائی جہان کا عمومی ضمیر اس بات پر زندہ دلیل ہے کہ اس حقیقت (آزادی ارادہ) کا اقرار تمام انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے کرتے ہیں اور ہمیشہ اسی کے طرفدار ہوتے ہیں اور زندگی کا ایک دن بھی اس عقیدہ کے بغیر نہیں گزار سکتے اور نہ اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی گاڑی اسکے بغیر چلا سکتے ہیں۔

عظیم فلسفی اور علم کلام کے ماہر ''خواجہ نصیر الدین طوسیؒ'' اپنی کتاب تجرید الاعتقاد میں جبر واختیار کی بحث کرتے ہوئے مختصر مگر جامع الفاظ میں فرماتے ہیں: والضرورۃ قاضیۃ باستنادافعالنا الینا۔ ہماری عقل وضمیر اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہمارے تمام افعال و اعمال کی نسبت خود ہماری طرف ہو۔

۲۔منطق ''جبر'' کا ''مذہب'' کی منطق سے تضاد

اب تک ہماری بیان کردہ گفتگو کا تعلق اس بات سے تھا کہ مکتب جبر جہان کے عقلاء کے عمومی ضمیر'' رکھتا ہے سے تضاد چاہے ان عقلائے عالم میں مذہب کو قبول کرنے والے ہوں یا انکار کرنے والوں ہوں۔

ہم مذہبی اعتبار سے بھی ایسے قطعی اور یقینی دلائل رکھتے ہیں کہ جو ''عقیدہ جبر'' کے باطل ہونے پر دلالت کرتے ہیں، کیونکہ مذہبی فکر کے مطابق بھی ''عقیدہ جبر'' بالکل قابل قبول نہیں ہے اور عقیدہ جبر کو قبول کرنے کی صورت میں مذہبی افکار و پروگرام بھی متاثر بلکہ مخدوش ہوجاتے ہیں کیونکہ ہم خداوند عالم کی عدالت کے مسئلہ کو (کہ جسکا مفصل ذکر گذشتہ بحث میں ہو چکا ہے) ''مکتب وعقیدہ جبر'' کی موجودگی میں کیسے ثابت کریں گے؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم پہلے کسی کو غلط کام پر مجبور کرے اور پھر اس سے باز پرس کرے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ یہ کسی طور پر بھی منطقی بات نہیں ہے!

لھذا عقیدہ جبر کو قبول کرنے کی صورت میں ''ثواب وعقاب''، ''جزا وسزا''، ''جنت و دوزخ'' بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح وہ تمام مفاہیم بھی جو آیات قرآن میں نامہ اعمال، الٰہی سوال وحساب بدکاروں کی مذمت اور صالحین کی ستائش میں ذکر ہوئے ہیں غیر اہم و بے معنی ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس عقیدے کی بنیاد پر نیکی اور بدی غیر اختیاری طور پر صادر ہوئیں ہیں۔

ان تمام حقائق کے علاوہ ہم مذہب میں سب سے پہلے انسان کی تکلیف اور ذمہ داریوں سے متعلق راہنمائی دیکھتے ہیں اور اگر انسان مجبور ہو تو پھر اس بحث اور راہنمائی کا

آیا کوئی مطلب ہے؟!

کیا کسی "رعشہ کے مریض" کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ حرکت نہ کرے؟ یا پاؤں سے معذور کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے؟

یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ایک معروف روایت میں مکتب جبر کو بت پرستوں کا مکتب اور شیطان کی جماعت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تلک مقالہ اخوان عبدۃ الاوثان و خصماء الرحمان و حزب الشیطان"

(اصول کافی ج/۱ ص۱۱۹ باب الجبر والقدر)

یہ بت پرستوں کے بھائیوں، دشمنان خدا اور شیطان کے گروہ کی باتیں ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے:

۱) عقیدہ جبر کے بطلان پر روشن ترین دلیل ذکر کریں؟

۲) تمام دنیا کے افراد کا ضمیر "ارادہ کی آزادی" کا اظہار کرتا ہے، اسکی وضاحت کریں؟

۳) کیا عقیدہ جبر کے قائلین عملی طور پر بھی "جبر" کے مطابق عمل کرتے ہیں؟

۴) کیا "عقیدہ جبر"، "خدا کی عدالت" کے موافق ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

۵) ہر قسم کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کیلئے انسان کو ارادہ میں آزاد ہونا چاہیئے یہ بات کیسے اور کیونکر صحیح ہے؟

آٹھواں سبق

امر بین الامرین (یا وسطی مکتب) کیا ہے؟

۱۔ جبر کے مقابلہ میں "عقیدہ تفویض"

عقیدہ جبر" جو کہ افراط پر مبنی ہے" کے مقابلہ میں دوسرا مکتب وعقیدہ بنام "تفویض" موجود ہے جو کہ تفریط پر مبنی ہے۔

عقیدہ تفویض کے قائل افراد کہتے ہیں کہ: خدا نے ہمیں پیدا کرنے کے بعد تمام کام ہمارے سپرد کر دیے ہیں اور اب اسکا ہمارے اعمال و افعال کیساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لھذا ہم اپنے اعمال کی سلطنت میں مستقل اور ان پر حاکم ہیں!

بلا شک وشبہ یہ عقیدہ بھی "عقیدہ توحید" کے بالکل موافق نہیں ہے کیونکہ "توحید" نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ یہ تمام جہان خدا کی ملکیت ہے اور کوئی بھی چیز اسکی دسترس سے خارج نہیں ہے، حتی کہ ہمارے اعمال ہمارے ارادہ کی آزادی کے باوجود اسکی دسترس اور قدرت سے ہرگز باہر نہیں ہو سکتے وگرنہ شرک کا عقیدہ لازم آتا ہے۔

مطلب کو زیادہ واضح کرنے کیلیے ہم کہتے ہیں کہ: ہم دو خداؤں کے قائل نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے ایک بڑا خدا کہ جس نے کائنات کو خلق کیا ہے اور دوسرا چھوٹا خدا یعنی

انسان" کہ جو اپنے تمام اعمال وافعال میں اتنا آزاد اور صاحب اختیار ہے کہ اب خداوند تعالی بھی اسکے اعمال وافعال پر اس سے باز پرس نہیں کر سکتا!

یہ واضح شرک ہے اور دو یا چند خداؤں کی پرستش ہے۔

اصلی اور حقیقی بات یہ ہے کہ ہم انسان کو آزاد اور صاحب اختیار بھی تسلیم کریں اور خدا کو اسکا حاکم اور اسکے اعمال کا نگران بھی مانیں۔

۲) مکتب واسطہ (یا درمیانی راہ کا عقیدہ)

اس بحث میں انتہائی قابل غور نکات ہیں اور ہمیں یہ تصور ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا دو باتیں متضاد ہیں، اس بات میں گہری فکر کی ضرورت ہے کہ ہم نہ صرف خدا کی "عدالت" کو مکمل طور پر تسلیم کریں اور لوگوں کیلیے "آزادی اور ذمہ داری" کے قائل ہوں بلکہ اسکی "توحید" وحدانیت اور تمام جہان پر اسکی حاکمیت کو بھی صدق دل سے قبول کریں اور یہی وہ نکتہ ہے کہ جسے "امر بین الامرین" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے (یعنی وہ عقیدہ کہ جس میں نہ افراط ہے اور نہ ہی تفریط ہے)

چونکہ بحث دقیق ہے لھذا ہم اسکو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسی ٹرین میں سفر کر رہے ہیں کہ جسکا انجن بجلی سے چلتا ہے اس ٹرین کے ڈرائیور بھی آپ ہیں، ایک بہت ہی طاقتور تار (جو کہ تمام راستے میں لائن کے اوپر لگی ہوئی ہے) سے انجن کی چھت پر لگا ہوا مخصوص پنجرہ ملا ہوا ہے اور اسکے ذریعے بجلی تاروں سے انجن میں منتقل ہو کر اسکی حرکت کا باعث بن رہی ہے اگر ایک لحظہ کیلیے بھی بجلی کی منتقلی منقطع ہو جائے تو گاڑی رک جائے گی۔

بلا شک آپ آزاد ہیں کہ راستے ہیں جہاں پر آپ چاہیں گاڑی کو روک سکتے ہیں اسے آہستہ یا تیز کر سکتے ہیں لیکن اس تمام آزادی کے باوجود وہ شخص جو کہ بجلی کے مرکز (پاور اسٹیشن) میں بیٹھا ہوا ہے جب چاہے بجلی کو بند کر کے آپکی ٹرین کو روک سکتا ہے کیونکہ آپ کی حرکت بجلی کی مرہون منت ہے اور اسکی چابی مرکز میں بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ہے۔

جب آپ اس مثال میں غور کریں گے تو واضح ہو جائے گا کہ وہ تمام تر آزادی، اختیار اور ذمہ داری کے باوجود کسی اور کے قبضہ میں ہے اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

دوسری مثال:

فرض کیجئے کسی حادثے کی وجہ سے کوئی شخص اعصابی طور پر معذور ہو جاتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے پر قادر نہیں رہتا، اگر اسکے اعصاب سے ایک خفیف اور مناسب برقی رو کو گزارا جائے تو اسکے اعصاب گرم ہو کر دوبارہ حرکت پر قادر ہو سکتے ہیں اب یہ شخص جب بھی کوئی کام کرے گا مثلا اسی ہاتھ سے کہ جس سے برقی رو کا اتصال ہے کسی پر ظلم کرتا ہے کسی کے چہرے پر طمانچہ مارتا ہے یا کسی بے گناہ کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا ہے تو وہ اپنی اس حرکت پر یقیناً جواب دہ ہوگا کیونکہ اس نے ''قدرت اور اختیار'' سے اس فعل کو انجام دیا ہے لھذا ''قادر ومختار'' شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

لیکن وہ جس نے برقی قوت سے طاقت انسان کے ہاتھ میں دی ہے اس پر حاکمیت بھی رکھتا ہے اور یہ انسان اپنی تمام تر آزادی واختیار کے باوجود اسکے قبضہ قدرت میں ہے۔

خدا نے ہمیں ہمت وطاقت عطا کی ہے، عقل، ہوش اور جسمانی قدرت سے نوازا ہے اور یہ تمام وسائل وانعامات ہر لحظہ خدا کی طرف سے ہمیں پہنچ رہے ہیں اگر ایک لحظہ کیلئے بھی یہ سلسلہ ختم ہو جائے اور ہمارا خدا سے رابطہ منقطع ہو جائے تو ہم اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔

ہم ہر کام اسکی طرف سے ہر لحظہ عطا کردہ قوت سے ہی انجام دیتے ہیں حتی کہ ہماری آزادی اور اختیار بھی اسی کی طرف سے عطا کردہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اسکی عظیم نعمات کے سایہ میں اپنے آپ کو منزل کمال تک پہنچا سکیں۔

پس ہم اختیار اور ارادہ کی آزادی کے ساتھ ساتھ اسکے قبضہ قدرت میں ہیں اور اسکی بارگاہ میں سر جھکائے ہوئے ہیں اور اسکی دسترس وحاکمیت سے ہرگز فرار نہیں ہو سکتے، ہم تمام تر قوت اور توانایی کے باوجود اسی کے مرہون منت ہیں اور اسکے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں اور یہی ''الامر بین الامرین'' کا معنی ہے کیونکہ نہ ہم ان موجودات کو خدا کی مثل قرار دیتے ہیں کہ شرک لازم آئے، اور نہ ہی بندگان خدا کو انکے اعمال میں مجبور مانتے ہیں کہ جسکے نتیجہ میں ظلم لازم آئے (غور وفکر فرمائیں)۔

ہم نے اس بات کا درس مکتب ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کیا ہے کیونکہ جب ان سے سوال کیا جاتا تھا کہ کیا جبر اور تفویض کے درمیان تیسرا راستہ بھی ہے؟ تو وہ فرماتے تھے ''ہاں'' تیسرا راستہ بھی موجود ہے جو کہ زمین اور آسمان کے درمیان فاصلہ سے بھی زیادہ وسیع ہے(۱)

(۱) اصول کافی ج/ اصفحہ ۱۲۱ باب الجبر والقدر والامر بین الامرین

۳) قرآن اور جبر و اختیار کا مسئلہ:

قرآن مجید واضح طور پر ''انسان کے ارادہ میں آزاد ہونے'' کی بات کرتا ہے اور اس مطلب پر قرآن مجید میں سینکڑوں آیات ذکر ہوئی ہیں۔

الف:

وہ تمام آیات کہ جن میں اوامر و نواھی اور ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنے ارادہ اور اختیار میں آزاد ہے کیونکہ اگر انسان آزاد نہ ہو تو اس کو بعض کاموں کا حکم دینا اور بعض کاموں سے روکنا عبث ولغو اور بے ہودہ شمار ہوگا (جبکہ قرآن ان نقائص سے پاک ہے)۔

ب:

وہ آیات جو بدکاروں کی مذمت اور اچھے لوگوں کی ستائش میں ہیں انسان کے خود مختار ہونے پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ ''جبر'' کی صورت میں ملامت یا مدح و ستائش بے معنی ہونگے۔

ج:

وہ تمام آیات ''جن میں قیامت سے متعلق سوال، اور اس خوف ناک دن کے ''فیصلے کا دن'' ہونے اور پھر اسکے نتیجہ میں عقاب یا انعام اور دوزخ یا جنت کا ذکر ہوا ہے'' انسان کے با اختیار ہونے پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ ''جبر'' کی صورت میں ان آیات کا کوئی مفہوم

نہیں ہوگا اور سوال و جواب، روز قیامت کی عدالت میں پیشی اور بدکاروں کو سزا ''ظلم محض'' شمار ہونگے۔

د:

وہ آیات جو انسان کو اسکے اعمال کا مرہون منت قرار دیتی ہیں جیسے:

"کلّ نفس بما کسبت رھینۃ" (سورہ مدثر آیت ۳۸)

ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے۔

"و کل امریء بما کسب رھین" (سورہ طور آیت ۲۱)

ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے۔

واضح طور پر انسان کے صاحب اختیار ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

ھ:

"انا ھدیناہ السبیل اما شاکراً و اما کفورا"
(دہر آیت ۳)

ہم نے اسے راستے کی ہدایت کردی خواہ شکرگزار بنے یا ناشکرا۔

اور اس جیسی دیگر آیات بھی ہمارے مدعیٰ کو ثابت کرتی ہیں۔

قرآن مجید میں بعض ایسی تعبیرات کا ذکر ہوا ہے کہ جو عقیدہ ''امر بین الامرین'' پر دلالت کرتی ہیں مگر بعض ناآگاہ قسم کے افراد نے ان آیات کو عقیدہ جبر کے حق میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً:

"و ما تشاؤن الا ان یشاء اللہ" (سورہ دہر آیت [illegible])

اورتم لوگ صرف وہی چاہ سکتے ہو جواللہ چاہتا ہے

یہ آیت اوراس جیسی دیگر آیات واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ (خدا) انسان سے اسکے ارادہ واختیار کوسلب نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ آیات اس حقیقت کو ثابت کرنے کیلئے ہیں کہ تم تمام اختیارات اور آزادی کے باوجود قبضہ قدرت خدا میں ہو۔

سوچیے اور جواب دیجیے:

۱) ''تفویض'' سے کیا مراد ہے؟ اوراس عقیدہ میں کیا عیب ہے؟

۲) مکتب ''امر بین الامرین'' کی تعلیم ہم نے ائمہ اہل بیت سے حاصل کی ہے اس مطلب کو مثال کیساتھ واضح کریں؟

۳) ''جبر'' اور ''اختیار'' کے بارے میں آیات قرآن کیا کہتی ہیں؟

۴) اگر ہم ''عقیدہ جبر'' کو صحیح تسلیم کرلیں تو پھر روز قیامت، جنت وجہنم اور سوال وجواب کے عقیدہ پر کیا نقص لازم آتا ہے؟

۵) کیا "وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ'' اوراس جیسی دیگر آیات ''جبر'' پر دلالت کرتی ہیں؟

نواں سبق

ہدایت اور گمراہی خدا کے ہاتھ میں!

۱)ہدایت اور گمراہی کی اقسام

ایک مسافر آپ کے پاس ایک ایڈریس لیکر آتا ہے اور آپ سے راہنمائی کا طلبگار ہے۔آپ کے پاس اسکی راہنمائی کے دو طریقے ہیں:

اول: آپ اسکے ہمراہ روانہ ہوتے ہیں اور تمام تر نیکی و حسن سلوک کیساتھ اسے اسکی مطلوبہ جگہ تک پہنچا کر واپس آجاتے ہیں۔

دوم: آپ ہاتھ کے اشارے یا مختلف نشانیوں کے ذریعہ اسے مطلوبہ جگہ کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

بے شک آپ نے دونوں صورتوں میں اسکو "ہدایت" کی ہے تاکہ وہ اپنی مطلوبہ جگہ تک پہنچ سکے، لیکن ان دونوں میں ایک فرق واضح ہے، دوسرا طریقہ صرف (ارائہ طریق یعنی) راستے کا دکھانا ہے جبکہ پہلا طریقہ (ایصال بہ مطلوب یعنی) مطلوبہ جگہ یا شخص تک پہنچانا ہے قرآن مجید اور اسلامی روایات میں ہدایت کے ان دونوں معانی کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک اور اعتبار سے کبھی ہدایت صرف "تشریعی" جنبہ کی حامل ہوتی ہے یعنی مختلف قوانین اور دستورات کے نتیجہ میں واقع ہوتی ہے اور کبھی "تکوینی" جنبہ اس میں کارفرما ہوتا ہے" یعنی خلقت کی راہوں سے ہدایت کی جاتی ہے جیسے ایک انسان کامل بننے کی طرف ایک نطفہ کے مراحل میں ہدایت، یہ دونوں معانی (جنبہ تشریعی وجنبہ تکوینی) بھی قرآن مجید اور روایات اسلامی میں ذکر ہوئے ہیں۔

اب جبکہ ہدایت کی اقسام واضح ہو چکی ہیں تو اصل مطلب کو شروع کرتے ہیں (یاد رہے کہ ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی ہے)

ہم بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں کہ ہدایت اور گمراہی خدا کے کام ہیں، بلاشبہ "ارائہ طریق" کا تعلق خدا سے ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے نمائندے (پیغمبران) بھیجے اور آسمانی کتب کو نازل کیا تاکہ وہ انسانوں کی صحیح راستے کی طرف راہنمائی کریں۔

لیکن جہاں تک زبردستی "ایصال الی المطلوب" یا جبراً صحیح مقصد تک ہاتھ پکڑ کر پہچانے کا تعلق ہے تو یہ چیز یقیناً "ارادہ واختیار کی آزادی" کے خلاف ہے لیکن چونکہ خداوند عالم نے منزل مقصود تک پہچانے کی تمام قوتیں ہمارے حوالے کردی ہیں اور وہی وہ ذات ہے کہ جو ہمیں اس چیز کی توفیق بھی دیتی ہے لھذا ہدایت کا دوسرا معنی بھی خداوند متعال کی طرف سے ہے یعنی تمام اسباب اور مقدمات کوانسان کے اختیار میں دے دیا گیا ہے گویا اسے منزل مقصود پر ہاتھ سے پکڑ کر پہنچادیا گیا ہے۔

۲)ایک اہم سوال

یہ ہے کہ ہم قرآنی آیات میں پڑھتے ہیں کہ: خدا

چاہے گمراہ کرتا ہے جیسے یہ آیت مجیدہ:

"فیضل اللہ من یشاء و یھدی من یشاء و ھو العزیز الحکیم" (سورہ ابراہیم آیت ۴)

(پھر اس کے بعد) اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی بڑا غالب آنے والا اور حکمت والا ہے

بعض سادہ لوح افراد قرآن کی دوسری آیات اور ان آیات کی تفسیر کو دیکھے بغیر فوراً یہ سوال کرتے ہیں کہ: خدا جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کردے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پس ہم نے کیا گناہ کیا ہے کہ خدا ہمیں بلاوجہ گمراہ کردے؟!

لھذا ضروری ہے کہ ہمیشہ آیات قرآن کا تجزیہ وتفسیر کرتے وقت انکا دوسری آیات سے باہمی رابطہ مدنظر رکھنا چاہیے تاکہ انکے اصلی وحقیقی مفہوم کو سمجھا جاسکے۔

ہم یہاں پر کچھ مزید آیات کو پیش کرتے ہیں جو ہدایت اور گمراہی کے متعلق ہیں تاکہ مذکورہ بالا آیت کیساتھ ملاکر ایک صحیح واصلی نتیجہ حاصل کیا جاسکے۔

سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۷ میں ہے:

"و یضل اللہ الظالمین"

اللہ ظالموں کو گمراہ کردیتا ہے۔

سورہ غافر کی آیت نمبر ۳۴ میں ہے:

"کذلک یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب"

اس طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کردیتا ہے جو تجاوز کرنے والے (اور) شک کرنے والے ہوتے ہیں۔

سورہ عنکبوت کی آیت نمبر ۶۹ میں ہے:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

اور جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے۔

جیسا کہ ہم مشاہدہ کررہے ہیں کہ خدا کی مشیت اور ارادہ بلاوجہ نہیں ہے نہ تو خدا کسی کو بلاوجہ ہدایت دیتا ہے اور نہ ہی کسی کو بغیر کسی وجہ کے گمراہ کرتا ہے اور اس سے توفیقات کو سلب کرلیتا ہے۔

وہ لوگ جو اسکی راہ میں جہاد کرتے ہیں جنگ کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں، نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا کے دشمنوں کے خلاف ثابت قدم رہتے ہیں خدا نے انکو ہدایت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ وعدہ عدالت کے عین مطابق ہے۔

لیکن وہ لوگ جو ظلم وستم کی بنیاد رکھتے ہیں اور ہمیشہ تجاوز، شک، تردید اور شیطانی وسوسہ کو لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں خداوند عالم ان سے ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور انکے ان برے اعمال کیوجہ سے انکے دل تاریک ہوجاتے ہیں جسکی وجہ سے وہ سعادت کی منازل تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں اور خدا کی طرف سے گمراہ کردینے کا مطلب یہی ہے یعنی پروردگار ہمارے برے اعمال کا نتیجہ خود ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے اور یہ بھی عین عدالت ہے۔ (دقت فرمائیں)

۳) خدا کا ازلی علم گناہ کرنے کی وجہ ہے؟!

جبر واختیار کی بحث میں آخری بات کہ جسکا ذکر ضروری ہے یہ ہے کہ بعض عقیدہ جبر

رکھنے والے افراد نے اپنے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے کیلئے "خدا کے علم ازلی" کو بطور بہانہ پیش کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں: کیا خدا جانتا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت کسی دوسرے شخص کو قتل کردے گا یا شراب پینے کا ارتکاب کرے گا؟ اور ہم کہیں کہ خدا نہیں جانتا تھا تو ہم خدا کے علم کا انکار کرتے ہیں، اور اگر کہیں کہ جانتا تھا تو ضروری ہے کہ اس کام کو (اگرچہ برا ہی ہو) انجام دیا جائے تا کہ خدا کے علم میں کوئی نقص لازم نہ آئے۔

لھذا علم خدا کے صحیح اور سچا ہونے کیلئے ضروری ہے کہ گناہگار مجبوراً گناہ کو انجام دیں اور اطاعت گزار مجبوراً اسکی اطاعت کریں!

لیکن اس قسم کے افراد جو کہ اپنے گناہوں اور خطاؤں پر پردہ ڈالنے کیلئے اس قسم کے بہانے تلاش کرتے ہیں اس حقیقت سے غافل ہوتے ہیں کہ "ہم کہتے ہیں خدا روز اول سے ہی جانتا ہے کہ ہم اپنے ارادے، اختیار اور طبیعت کے میلان کی وجہ سے اطاعت یا گناہ کریں گے" یعنی ہمارا اختیار اور ارادہ بھی خدا کے علم میں ہے پس اگر ہم مجبور ہوں تو خدا کا علم جہالت میں تبدیل ہو جائے گا (دقت فرمائیں)

اس بات کو مزید واضح کرنے کیلئے ہم کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں:

فرض کریں کہ ایک استاد کو اس بات کا علم ہے کہ اسکی کلاس کا فلاں شاگرد اپنی سستی اور نالائقی کی وجہ سے فیل ہو جائے گا اسکا یہ علم سو فیصد صحیح ہے کیونکہ اسکے سالہا سال کے تجربات پر مبنی ہے۔

کیا فیل ہونے کے بعد وہ شاگرد اپنے استاد کے گریبان کو پکڑ کر کہہ سکتا ہے کہ تمھاری پیشین گوئی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں فیل ہو جاؤں؟!

اس سے بھی بہتر مثال یہ کہ فرض کریں ایک نیک سیرت اور بے خطا انسان ایک بڑے حادثے کے وقوع سے قبل اس سے آگاہ ہو جاتا ہے اور کسی مصلحت کی وجہ سے اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتا، کیا اس نیک سیرت شخص کا علم اس مجرم کے جرم اور ذمہ داری کو ختم کر دیگا اور اس مجرم کو جرم کرنے کیلئے مجبور کرے گا؟! (دقت فرمائیں)

یا فرض کریں ایک ایسے جدید ترین کمپیوٹر کی ایجاد ہوتی ہے جو آئندہ ہونے والے حوادث کی خبر کچھ گھنٹے پہلے ہمیں بتا دیتا ہے اب ہمیں وہ کمپیوٹر دقیق اطلاع دیتا ہے کہ فلاں شخص اپنے مکمل اختیار اور ارادے سے فلاں کام فلاں وقت کرے گا۔ کیا یہ پیشین گوئی کسی پر جبر و زبردستی کہلائے گی؟! کہ وہ خواہ نخواہ اب اس کام کو انجام دے؟

خلاصہ کلام یہ کہ علم خدا کسی کو بھی ہرگز کسی کام پر مجبور نہیں کرتا۔

سوچیے اور جواب دیجیے:

۱) ہدایت کی کتنی اقسام ہیں؟ وضاحت کریں۔

۲) کچھ ایسی آیات کی وضاحت کریں جن میں ہدایت اور گمراہی کی نسبت خداوند متعال کی طرف دی گئی ہے؟

۳) ہدایت الٰہی اور ضلالت الٰہی سے کیا مراد ہے؟

۴) ''خدا کے ازلی علم'' سے کیا مراد ہے؟

۵) کیا خدا کا ازلی علم ہمارے اختیار اور ذمہ داریوں کو ختم کر دیتا ہے؟ مثال دے کر اس بات کی وضاحت کریں؟

دسواں سبق

خدا کا عدل اور مسئلہ ''خلود''

اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید واضح طور پر گناہگاروں اور کفار کے ایک گروہ سے متعلق کہتا ہے کہ انکی سزا دائمی، ہمیشہ ہے یعنی بالفاظ دیگر ''خلود'' پر مبنی ہوگی۔

سورہ توبہ کی آیت ۶۸ میں ارشاد خداوند ہے۔

"وعد اللہ المنافقین و المنافقات والکفار نار جھنم خالدین فیھا"

اللہ نے منافق مردوں اور منافقہ عورتوں اور کافروں سے آتش جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اسی طرح آیت نمبر۷۲ میں باایمان مرد اور خواتین کے ساتھ بہشت کے باغات کا وعدہ بھی ہمیشہ کیلئے ہے۔

"وعد اللہ المومنین والمومنات جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا"

اللہ نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں سے ایسے (جنت کے) باغات کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس بات کو تسلیم کیا جاسکتا ہے "ایک انسان جس نے زیادہ سے زیادہ اسی سال یا سو سال زندگی گذاری ہو اور مختلف گناہ اس سے سرزد ہوئے ہوں اسے لاکھوں، کروڑوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سال سزا دی جائے۔

البتہ یہی مطلب نیک اعمال کی جزا کے سلسلہ میں زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے کیونکہ خدا کی رحمت ایک سمندر سے بھی زیادہ وسیع ہے اور جزا جتنی زیادہ ہوگی خدا کی رحمت اور اسکے فضل کے عین مطابق ہوگی۔

لیکن برے اعمال اور محدود گناہوں کے نتیجہ میں ہمیشہ کیلئے اسکو عذاب میں مبتلا رکھنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے اور خداوند متعال کی عدالت کو دیکھتے ہوئے اتنی دائمی سزا کی کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے؟

کیا گناہ اور اسکی سزا کے درمیان مطابقت نہیں ہونی چاہیے؟ (یعنی جتنا گناہ کیا جائے اتنی ہی سزا دی جائے)۔

جواب:

اس گفتگو اور ان سوالات کے درست جوابات کیلئے چند نکات سے متعلق گہرائی تک غور و فکر کی ضرورت ہے:

الف:

قیامت اور اسکے بعد کی سزائیں اس جہان کی سزاؤں سے کسی طور پر بھی شباہت نہیں رکھتیں مثلاً اگر کوئی شخص دنیا میں کوئی غلط کام، چوری وغیرہ کرتا ہے تو اسے ایک خاص عرصہ

تک قید کردیا جاتا ہے لیکن قیامت کی سزائیں اسکے گناہوں اور اعمال کے آثار اور اسکے کاموں کی خصوصیات کے اعتبار سے ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں گناہ گاروں کی تمام سزائیں جنکا سامنا وہ اگلے جہان میں کریں گے درحقیقت انکے اپنے کیے گئے گناہوں کا نتیجہ ہے جو انکے دامن گیر ہوگا۔

اس مقام پر قرآن مجید میں واضح تعبیر موجود ہے سورہ یٰسین کی آیت نمبر ۵۴ میں ارشاد خداوندی ہو رہا ہے:

"فالیوم لا تظلم نفس شیئا و لا تجزون الا ما کنتم تعملون"

اس روز کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور تمہیں بس وہی بدلہ دیا جائے گا جیسا تم عمل کرتے رہے ہو۔

ایک سادہ سی مثال سے ہم اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایک شخص نشیات اور شراب وغیرہ کا کثرت سے استعمال کرتا ہے اسے اس قبیح کام سے جتنا بھی منع کیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ ان زہریلی چیزوں کے استعمال سے تمہارا معدہ خراب ہوجائے گا تمہارے دل کی حرکت متاثر ہوگی اور تمہارے اعصاب مجروح ہوجائیں گے مگر وہ ان باتوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔

چند ہفتے یا چند ماہ وہ اس خیالی لذت میں مبتلا رہتا ہے اور بتدریج مختلف بیماریوں معدہ کے زخم، دل اور اعصاب کی کمزوری کا شکار ہوجاتا ہے اور پھر دسیوں سال (اپنی عمر کے آخر تک) ان بیماریوں میں مبتلا ہوکر شب و روز ان کی اذیت میں گزارتا ہے، کیا یہاں پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس شخص نے تو چند روز یا چ[illegible] نشیات کا استعمال کیا تھا مگر

کیوں وہ تاحیات امراض میں مبتلا ہو گیا؟

اس اعتراض کے جواب میں فوراً کہا جائے گا کہ یہ اسکے اعمال کا نتیجہ ہے یہاں تک کہ اگر وہ حضرت نوح سے بھی زیادہ عمر پائے اور اسے ہم ہمیشہ بیماری کی اذیت میں مبتلا دیکھیں تو تب بھی ہم کہیں گے کہ اس نے دانستہ اور آگاہ ہونے کے باوجود ان تمام امراض کو خود اپنے لیے تیار کیا ہے۔

روز قیامت کی جزا و سزا اس (چند سالہ یا کئی سالہ بیماری) سے بھی زیادہ ہے لھذا عدالت خدا پر کسی بھی قسم کا اعتراض باقی نہیں رہتا۔

ب: بعض افراد یہ گمان کرتے ہیں کہ سزا کی مدت اور زمانہ اتنا ہی ہونا چاہیے جتنا گناہ کا زمانہ ہے، یہ ایک بڑی غلطی ہے، کیونکہ گناہ اور اسکی سزا کے درمیان زمانہ کے اعتبار سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ سزا کا تعلق اس گناہ کی کیفیت اور نتیجہ سے ہے۔

مثلاً ایک شخص صرف ایک لحظہ میں کسی انسان کو بے جرم و خطا قتل کر دیتا ہے اس دنیا کے بعض قوانین کے مطابق اسکو عمر قید کی سزا دی جاتی ہے اس مثال میں قتل کرنے کی مدت ایک لحظہ ہے جبکہ سزا دسیوں سال پر محیط ہے، کوئی شخص بھی اس سزا کو "ظالمانہ سزا" شمار نہیں کرتا کیونکہ یہاں پر منٹ، گھنٹے، مہینے یا سال کی بات نہیں ہے بلکہ اس گناہ کی کیفیت اور نتیجہ کو دیکھا جائے گا۔

ج: "خلود و ہمیشگی" اور جہنم کی دائمی سزائیں صرف ان لوگوں کیلئے ہیں کہ جنہوں نے نجات کے تمام راستے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں اور جان بوجھ کر فساد، تباہی، کفر و نفاق میں غرق ہیں اور گناہوں نے انکے سارے وجود کو ایسا تاریک کر دیا ہے کہ وہ مجسم گناہ بن کر رہ گئے ہیں۔

سورہ بقرہ کی آیت ۸۱ میں ایک خوبصورت تعبیر ذکر کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

"بلی من کسب سیئة و احاطت به خطیئته فاولئک اصحاب النار هم فیها خالدون"

جو کوئی بدی اختیار کرے اور اس کے گناہ اس پر حاوی ہو جائیں تو ایسے لوگ اہل دوزخ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اس قسم کے افراد نے مکمل طور پر خداوند عالم سے اپنا رابطہ منقطع کر لیا ہوتا ہے اور نجات کے تمام راستے اپنے اوپر بند کر لیے ہوتے ہیں گویا ان افراد کی مثال اس پرندے کی طرح ہے جو اپنے پروں کو توڑ کر آگ لگا دے اور ہمیشہ کیلئے آسمان کی طرف پرواز کرنے سے محروم رہے اور زمین پر رہنے پر مجبور ہو جائے۔

مذکورہ بالا تینوں نکات اس حقیقت کو روشن کرتے ہیں کہ دائمی عذاب کا مسئلہ جو کہ منافقین اور کفار کے ساتھ مخصوص ہے ہرگز "عدالت الہی" کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ انکے برے اعمال کا نتیجہ ہے اور انکو پہلے ہی اس بات سے پیغمبران الہی کے ذریعے آگاہ کیا جا چکا ہے کہ ان کاموں کا نتیجہ انتہائی تلخ اور برا ہے۔

اگر یہ افراد جاہل ہوں، انبیاء کی دعوت ان تک نہ پہنچی ہو اور انہوں نے جہالت اور نادانی کی بنیاد پر ان اعمال کا ارتکاب کیا ہو تو یقیناً وہ اس سزا کے مستحق نہیں ہونگے۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ آیات قرآن اور روایات اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت الہی کا سمندر اس قدر بڑا اور وسیع ہے کہ خطا کاروں کے بہت بڑے بڑے گروہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بخشے جائیں گے۔

کچھ گروہ شفاعت کے ذریعے

کچھ گروہ معافی کے ذریعے

اور کچھ گروہ معمولی نیکی کر کے خدا کے فضل سے کثیر اجر پا کر بخشے جائیں گے۔

اور کچھ گروہ ایک مدت تک دوزخ میں اپنے برے اعمال کی سزا پا کر اور الٰہی بھٹی سے گزر کر پاک وصاف ہو کر رحمت اور نعمات الٰہی سے بہرہ مند ہونگے۔

صرف ایک گروہ جہنم میں ہمیشہ کیلیے باقی رہ جائے گا اور وہ گروہ حق کے کیخلاف اپنی دشمنی اور لجاجت، ظلم وفساد اور بے حد منافقت کی وجہ سے سرتا پا کفر اور بے ایمانی کے گھرے اندھیروں میں ڈوبا ہوا گروہ ہوگا۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) بعض افراد جہنم کی دائمی سزا کو خدا کے عدل کے خلاف کیوں شمار کرتے ہیں؟

۲) کیا آخرت کی سزائیں اس دنیا کی سزاؤں کی طرح ہیں؟ اگر نہیں تو اسکی وجہ کیا ہے؟

۳) کیا عدالت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ گناہ کی مدت اور سزا کی مدت برابر ہونی چاہیے؟

۴) جہنم کی دائمی سزائیں کن لوگوں کیلیے ہیں؟

۵) عفو الٰہی سے کون لوگ بہرہ مند ہونگے؟

نبوت

پہلا سبق

ہمیں رہبران الٰہی کی احتیاج

ہمارے علم ودانش کا محدود ہونا۔

ممکن ہے بعض افراد یہ سوچیں کہ کیا اصولی طور پر ہماری راہنمائی کیلئے خدا کی طرف سے انبیاء کا مبعوث ہونا ضروری ہے؟ کیا ہماری عقل وفہم حقائق کا ادراک کرنے کیلئے کافی نہیں ہے؟ کیا انسان کی علمی ترقی پوشیدہ رازوں تک پہنچنے اور تمام حقائق کو واضح کرنے کیلئے اسکی مددگار نہیں ہے؟

اور پھر وہ چیزیں جو انبیاء ہمارے لیے لیکر آئیں ہیں وہ دو حال سے خارج نہیں ہیں: یا تو ہماری عقل انکو بخوبی درک کرسکتی ہے یا اسکے برعکس ہماری عقل ان کے ادراک سے قاصر ہے۔

پہلی صورت میں ہم انبیاء کی زحمت کے محتاج نہیں ہیں جبکہ دوسری صورت میں ہم ان چیزوں (اصول وقواعد) کو کیوں قبول کریں جو ہماری عقل وخرد کے ہی خلاف ہیں!

بالفاظ دیگر: آیا یہ درست ہے کہ انسان اپنے آپکو دوسروں کے اختیار میں دے دے؟

اور انکے احکامات وارشادات کو بغیر کسی چون وچرا کے قبول کرلے؟ کیا انبیاء ہماری ہی طرح انسان نہیں ہیں؟ ہم اپنے آپکو کیسے اپنی طرح کے انسانوں کے حوالے کرسکتے ہیں؟

جوابات:

چند نکات کی طرف متوجہ ہونے سے ان تمام سوالات کے جواب اور انسانی نظام زندگی میں انبیاء کا مقام واضح ہوجائے گا:

۱۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا علم وشعور انتہائی محدود ہے اور اس تمام تر علمی ترقی و وسعت کے باوجود جو کہ بشر کو نصیب ہوئی آج ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں اس کے مقابلے میں وہ اشیاء کہ جن کا ہمیں علم نہیں ہے ایسے ہی ہے جیسے پانی کا ایک قطرہ دریا کے مقابلہ میں یا ایک تنکا پہاڑ کے مقابلہ میں یا بعض عظیم دانشمندوں کے کہنے کے مطابق: آج ہم جتنا بھی علم رکھتے ہیں وہ اس کائنات کے تمام علم کے مقابلہ میں الف، ب شمار ہوسکتا ہے، یا یوں کہیں گے کہ حقیقت یہ ہے ہماری عقل وشعور اور فیصلہ کی جگہ یک انتہائی محدود سی ہے کہ جسے علم ودانش کی شعاعوں نے روشن کیا ہے، ہم اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتے۔

انبیاءؑ تشریف لائے اور ہماری ضرورت اور حاجت کے مطابق ہماری عقل وشعور کی اس وسیع جگہ کو منور کیا درحقیقت ہماری عقل ایک طاقتور روشنی پھیلانے والی چیز کی مانند ہے، لیکن انبیاءؑ اور الٰہی پیغامات ایک ایسے خورشید کی مانند ہیں جو تمام کائنات کو روشن کیے ہوئے ہیں کیا کوئی ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کرسکے کہ چونکہ میں خود روشنی پھیلانے والی طاقتور چیز رکھتا ہوں لھذا سورج کا محتاج نہیں ہوں؟!

زیادہ بہتر انداز میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ:

زندگی کے مسائل کو تین گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ''معقول''، ''غیر معقول'' اور ''مجہول'' انبیاءؑ کبھی بھی غیر معقول بات ''یعنی ایسی چیز جو عقل وخرد کے خلاف ہو'' نہیں کہتے اور اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں تو وہ پیغمبر نہیں ہیں انبیاءؑ تو ہماری عقل وشعور کے مددگار ہوتے ہیں تا کہ ہم نامعلوم چیزوں کا علم حاصل کرسکیں اور یہ بات ہمارے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔

لھذا وہ افراد جو زمانہ ماضی میں کہتے تھے کہ عقل وخرد کے ہوتے ہوئے انبیاءؑ کی ضرورت نہیں ہے ''جیسے برہمن لوگ جو کہ ہندوستان اور بعض دیگر علاقوں میں رہتے ہیں'' یا وہ لوگ جو آج یہ کہتے ہیں کہ اس تمام علمی ترقی اور کامیابیوں کے بعد انسان انبیاءؑ اور ان کی تعلیمات کا محتاج نہیں ہے، تو وہ نہ انسان کے علم ودانش کی وسعت کو جانتے ہیں اور نہ انبیاءؑ کی رسالت کا ادراک رکھتے ہیں۔

یہ لوگ ایسے ہی ہیں کہ جیسے ایک بچہ پہلی کلاس میں ایک ہی سبق پڑھنے کے بعد یہ کہے کہ میں اب تمام چیزوں کو جانتا ہوں اور مجھے کسی معلم یا استاد کی ضرورت نہیں ہے، کیا یہ دعویٰ بے اساس نہیں ہے؟ انبیاءؑ تو صرف معلّم ہی نہیں ہیں ان کی رہبری کا مسئلہ ایک الگ بحث کا متقاضی ہے کہ جسے ہم بعد میں تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے۔

۲) کوئی بھی شخص یہ نہیں کہتا کہ انسان اپنے آپ کو اپنے تمام تر اختیارات اور وجود کے ساتھ اپنے ہی جیسے کسی شخص کے حوالے کردے، بحث یہ ہے کہ انبیاءؑ جیسا کہ ہم بعد میں ثابت کریں گے وہ وحی آسمانی کے ساتھ یعنی خداوند متعال کے لامحدود علم کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم قطعی دلائل کے ساتھ ان کے خدا کے ساتھ رابطے کو پہچانیں

کہ جس کے نتیجے میں ہم نا صرف ان انبیاءؑ الٰہی کی باتوں کو قبول کریں گے بلکہ ان کی تعلیمات پر دل و جان سے عمل بھی کریں گے۔

اگر ہم ایک ماہر اور حاذق طبیب کے نسخہ پر عمل کریں تو کیا ہم نے کوئی غلط کام کیا؟ انبیاءؑ ہمارے بہت بڑے روحانی طبیب ہیں، اگر ہم اپنے معلم اور اساتذہ کے درس کو جو ہماری عقل و فکر کے مطابق ہے، قبول کرلیں تو کیا یہ ایک غلط فعل ہے؟ انبیاءؑ انسانیت کے سب سے بڑے معلم ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ ہم ان دلائل سے متعلق گفتگو کریں کہ جو خدا کی طرف سے انبیاءؑ کی بعثت کو ضروری قرار دیتے ہیں:

ہمارے پاس تین ایسی روشن دلیلیں ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم انبیاءؑ کی رہنمائی کے محتاج ہیں:

تعلیم کے اعتبار سے احتیاج

اگر ہم نور کی ایک خیالی اور افسانوی سواری پر سوار ہوں اور ہر ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر "یا پچاس ہزار فرسخ" کی رفتار سے اس لامحدود کائنات کی سیر کریں، کسی شک اور تردید کے بغیر ہمیں حضرت نوحؑ کی عمر جیسی ہزاروں عمریں درکار ہونا چاہیں تا کہ ہم اس عظیم کائنات کے کسی ایک گوشے کا نظارہ کرسکیں۔

یہ کائنات اپنی ان تمام حیرت اور سحر انگیز وسعتوں کے ساتھ یقیناً بیہودہ اور فضول نہیں بنائی گئی اور جیسا کہ ہم خداشناسی کے اسباق میں جان چکے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی بھی فائدہ یا نفع خدا کیلئے نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو ہر نظر سے کامل و اکمل، بے نیاز

، لامحدود اور ہر قسم کے نقص سے پاک ہے اور اس نے اس کائنات اور انسان کو اس لیے نہیں بنایا کہ اپنے کسی نقص کو دور کرے۔

لھذا ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا کا ہدف یہ تھا کہ دوسروں پر اپنا جود و کرم کرے اور تمام موجودات کو کامل کرے جیسے سورج کہ جو ہم زمین والوں پر چمکتا ہے حالانکہ وہ ہمارا محتاج نہیں ہے سورج کی یہ روشنی صرف ہمارے فائدہ کیلئے ہے وگرنہ ہم سورج کیلئے کون سی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

کیا صرف ہماری معلومات رشد و تکامل کی راہ طے کرنے اور ایک انسان کامل کے مرحلہ تک پہنچنے کیلئے کافی ہیں؟

ہم اس کائنات کے اسرار و رموز میں سے کتنے رازوں سے آگاہ ہیں؟

اصلاً زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کائنات کب سے وجود میں آئی ہے؟ کوئی بھی شخص ان سوالات کے صحیح اور دقیق جوابات نہیں جانتا یہ سب کچھ کب تک باقی رہے گا؟ اس کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔

اجتماعی اور اقتصادی زندگی کے حوالے سے ہر دانشور اپنا ایک الگ نظریہ رکھتا ہے، مثلاً ایک گروہ سرمایہ داری کا قائل ہے جبکہ دوسرا گروہ سوشلزم اور کمیونیزم کے نظریات کا حامی اور تیسرا گروہ نہ پہلے کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو اور دونوں گروہوں کے نظریات کو غلط قرار دیتا ہے اسی طرح زندگی کے دیگر مسائل میں بھی دانشوروں کی آراء بہت زیادہ اور مختلف ہیں۔

انسان حیرت زدہ ہے کہ کونسا نظریہ اختیار کرے؟! اس مقام پر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ خلقت کے اصلی اور حقیقی ہدف یعنی "انسان کی تمام

ابعاد میں پرورش، نمو اور تکامل" تک پہنچنے کیلئے ایسی تعلیمات کی ضرورت ہے کہ جو صحیح، حقیقی ہر قسم کی خطاؤں سے پاک اور زندگی کے حقائق کے مطابق ہوں ایسی تعلیمات کہ جو اس طویل راہ میں اصلی مقصد تک پہنچنے کیلئے انسان کی مددگار ثابت ہوسکیں۔

اور یہ سب کچھ صرف اور صرف علم خدا یعنی انبیاء کے ذریعے حاصل ہونے والی آسمانی وحی سے ہی ممکن ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کہ جس نے ہمیں ان راستوں کو طے کرنے کیلئے پیدا کیا ہے ضروری ہے کہ ان کا علم اور معرفت بھی ہمیں عطا کرے......

اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں رہبری کی ضرورت

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے وجود میں عقل و دانائی کے علاوہ ایک اور قوت بھی موجود ہے کہ جس کا نام "غرائز اور میلانات" ہیں: غریزہ خود پسندی، غریزہ خشم و غضب، غریزہ شہوت اور اس قسم کے دیگر میلانات ور جحانات۔

بلاشک وشبہہ اگر ہم اپنے ان غرائز کو بے مہار چھوڑ دیں تو ہماری عقل اور دانائی قید ہوجائے گی اور انسان تاریخ کے ظالم اور جابر لوگوں کی طرح ایسے بھیڑیے کی شکل اختیار کرلے گا کہ جو ہر اعتبار سے جنگل کے بھیڑیوں سے بھی خطرناک تر ہے۔

ہم اخلاقی تربیت کیلئے ایک تربیت کرنے والے استاد کے محتاج ہیں ایک "نمونہ" اور "اسوۃ" کے محتاج ہیں تاکہ قانون "محاکات" (۱) کے تحت اس کی گفتار و رفتار کے مطابق

---

۱) محاکات ایک دوسرے سے مشابہ ہونا۔ کسی چیز یا حالت کی نقل کرنا۔ پس جس سے مشابہ ہونے کی انسان کوشش کرے اور جس ہستی کی نقل کرے اسے نمونہ اور اسوہ ہونا چاہیے۔

عمل کرسکیں یہ ضروری ہے کہ ایک کامل اور تربیت یافتہ انسان اس خطرناک اور نشیب و فراز سے پر راستے میں ہمارا ہاتھ پکڑے اور ہمیں غرائز کے طوفان سے بچائے، اخلاقی فضائل کے اصولوں کو اپنے عمل اور گفتار سے ہمارے دل و جان پر نقش کرسکے" شجاعت و توانائی، انسان دوستی، مروت، درگذر کرنا، وفاداری، سچائی، امانتداری اور پاک دامنی کو ہماری روح میں پروان چڑھائے۔

آیا انبیاء معصومین کے علاوہ کوئی ایسا مربی اور رہنما ہمیں مل سکتا ہے؟ اس دلیل کے بعد ممکن نہیں ہے کہ ہمارا مہربان اور ہر شئی پر قدرت رکھنے والا خدا ہمیں اس قسم کے رہنماؤں سے محروم رکھے۔

(اس بحث کا باقی حصہ آئندہ سبق میں پڑھیں)

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) آپکا علم و دانش جس قدر بھی زیادہ ہو جائے کیا آپ یہ احساس کرتے ہیں کہ آپ کی جہالت آپ کے علم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے؟ مثال دیجیے۔

۲) کیا آپ اندھی تقلید اور انبیاءؑ کی اطاعت و پیروی کے درمیان فرق واضح کرسکتے ہیں؟

۳) اگر ہم کسی رہنما کے بغیر ایک غیر معلوم راہ کو اختیار کریں تو ہمیں کن خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا؟

۴) ہم انبیاءؑ کی رہنمائی کے کس قدر محتاج ہیں وضاحت کیجیے؟

۵) کیا آپ یہ بتاسکتے ہیں کہ اس درس کے پڑھنے کے بعد کونسی ایسی شیء باقی رہ گئی ہے جو آئندہ سبق میں کہی جائیگی۔

دوسرا سبق

اجتماعی قانون گذاری کیلئے انبیاء کے وجود کی ضرورت

ہم گذشتہ سبق میں ''تعلیم'' اور ''تربیت'' کے حوالے سے وجود انبیاءؑ کی ضرورت کے بارے میں جان چکے ہیں اب ہم اجتماعی قوانین کیلئے انبیاءؑ کے اہم کردار کے بارے میں بحث کریں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسانوں کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت کہ جو اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نظر آتی ہے اور اس کی تمام تر ترقی کا باعث ہے یہی مصروف اجتماعی زندگی ہے۔

بلاشک وتردید اگر انسان ایک دوسرے سے جدا زندگی گذارتے تو آج بھی اس کی فکری سطح اور تہذیب وتمدن پتھر کے زمانے کے انسان جیسی ہی ہوتی!

جی ہاں یہ اجتماعی تلاش اور کوشش کا نتیجہ ہی ہے کہ رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کا چراغ روشن ہے اور یہ اجتماعی کوشش کا ہی نتیجہ ہے کہ نئے نئے علمی انکشافات اور اختراعات ہمارے سامنے موجود ہیں مثال کے طور پر اگر ہم چاند تک پہنچنے کے سفر کو دیکھیں تو یہ کام ایک یا چند بڑے دانشمندوں کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ [illegible]

کے ہزاروں سال کے مطالعات، انکشافات اور تجربات کا نتیجہ ہے کہ انسان اس عظمت تک پہنچ سکا۔

یا اگر ایک انتہائی ماہر ڈاکٹر ہمارے زمانے میں ایک مردہ انسان کے قابل استفادہ دل کو نکال کر کسی دوسرے قریب المرگ انسان کے سینے میں لگا کر اسے حتمی موت سے ایک عرصے تک کیلئے بچا لیتا ہے تو یہ ہزاروں بلکہ لاکھوں ڈاکٹروں، طبیبوں اور جراحوں کے طویل تجربات کا نتیجہ ہے کہ جو اساتذہ سے شاگرد در شاگرد منتقل ہوئے ہیں۔

لیکن ان تمام تر اچھائیوں اور برکات کے باوجود اجتماعی زندگی میں بہت سی مشکلات بھی حائل ہیں اور وہ انسانوں کے باہمی منافع اور حقوق کا آپس میں متصادم ہونا اور نتیجہ میں جنگ وجدال کا وجود میں آنا ہے۔

اس مقام پر ہمارے لیے قواعد وضوابط، قوانین اور ایک منظم پروگرام کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے، قوانین ہماری تین بڑی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں:

۱) اجتماع اور معاشرے کے حوالے سے ایک انسان کی ذمہ داریوں اور ایک فرد کے حوالے سے معاشرہ کی ذمہ داریوں کو قوانین ہی واضح کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارتے اور کوششوں کو مربوط رکھتے ہیں۔

۲) قانون ہی افراد کے اپنے وظائف کی انجام دہی پر ایک حد تک ضروری نگرانی کیلئے راہ ہموار کرتا ہیں۔

۳) قانون ہی مختلف افراد کو ایک دوسرے کے حقوق پامال کرنے سے روکتا ہے اور مختلف گروہوں کے آپس میں تصادم اور معاشرہ کو ہرج ومرج سے بچاتا ہے اور کسی بھی زیادتی کی صورت میں زیادتی کرنے والے کیلئے مناسب سزاؤں کا تعین کرتا ہے۔

بہترین قانون ساز کون ہے؟

اب ہمیں جاننا چاہیے کہ انسانی ضروریات کے مطابق بہترین قوانین کون بنا سکتا ہے؟ ایسے قوانین کہ جو مندرجہ بالا تینوں اصولوں کے مطابق ہوں یعنی نہ صرف افراد کی ذمہ داریوں کو معیّن کریں بلکہ فرد اور اجتماع کے حقوق بھی روشن کریں اور نا صرف ان کے تمام کاموں پر مکمل نگران ہوں بلکہ زیادتی کرنے والوں کا احتساب بھی کریں۔

ہم یہاں پر ایک سادہ سی مثال بیان کرتے ہیں: انسانی معاشرے کو ہم ایک بہت بڑی ٹرین اور قانون ساز ادارے کو اس کے انجن (Engine۔ Locomotive) سے تشبیہ دیتے ہیں کہ جو اس بہت بڑی ٹرین کو حرکت میں لاتا ہے قانون ایک آہنی ریلوے لائن کی طرح ہے جو اس گاڑی کو اس کے اصلی ہدف تک پہنچانے کیلئے مددگار ثابت ہوتا ہے یعنی ایک ایسا راستہ ہے جو مختلف پیچ وخم اور نشیب وفراز سے گذرتا ہے، ایک ریلوے لائن کیلئے درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے: جس زمین سے گاڑی نے گذرنا ہو وہ اس کے بوجھ کو برداشت کر سکے لائن کے دونوں خطوط کے درمیان انجن کے پہیوں کے فاصلے کے مطابق انتہائی دقیق اور مناسب فاصلے کا ہونا ضروری ہے اسی طرح راستے میں آنے والوں غاروں کی دیواریں اور بلندی گاڑی کی بلندی کے مطابق ہوں، راستے کے نشیب وفراز اس قدر سخت اور زیادہ نہیں ہونے چاہیئے کہ گاڑی کی بریکیں اور ان کا پریشر اس کا ساتھ نہ دے سکیں اسی طرح پہاڑوں کے اطراف سے پتھروں کا گرنا، کھائیوں کے ان کناروں کا گرنا جہاں سے گاڑی گزرتی ہے اور سیلاب کو مدنظر رکھنا ضروری ہے تاکہ گاڑی صحیح وسالم اس راستے کو طے کر سکے، اس مثال کے بعد ہم انسانی

معاشرے کی بحث کی طرف لوٹتے ہیں وہ قانون ساز جو چاہتا ہے کہ انسانوں کیلئے بہترین قانون بنائے اس میں درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

۱) نوع انسان اور انکی غرائز، مشکلات اور ضروریات کو مکمل طور پر جانتا ہو۔

۲) انسانوں کی تمام تر توانائی اور استعداد کو مدنظر رکھے اور ان کو نکھارنے کیلئے قوانین اجراء کرے۔

۳) ہر قسم کے وہ حوادث جو کہ ممکنہ طور پر معاشرے کو پیش آسکتے ہیں اور اسی طرح ان کا عکس العمل، ان کیلئے قبل از وقت آگاہی حاصل کرے۔

۴) معاشرے سے اسکے کسی بھی قسم کے منافع مربوط نہ ہوں تا کہ قوانین بناتے وقت وہ اپنے یا اپنے رشتہ داروں یا اپنی جماعت کے منافع کی طرف متوجہ نہ ہو۔

۵) ضروری ہے کہ یہ قانون ساز مستقبل کی انسانی ترقی یا نقصان سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔

۶) ضروری ہے کہ یہ قانون ساز خطا، اشتباہ اور ہر قسم کی بھول چوک سے بچا ہوا ہو۔

۷) ضروری ہے کہ یہ قانون ساز اتنی طاقت اور قدرت رکھتا ہو کہ معاشرے کے کسی بھی فرد کی قدرت اور طاقت سے نہ ڈرے اور ہر حال میں انتہائی مہربان، غمخوار اور خیر خواہ ہو۔

یہ شرائط کس میں موجود ہیں؟

آیا انسان بہترین قانون ساز ہوسکتا ہے؟

آیا آج تک کسی نے انسان کو مکمل طور پر پہچانا ہے؟ حالانکہ ہمارے زمانے کے ایک

بڑے دانشور نے انسان کے متعلق ایک مفصل کتاب لکھی ہے اور اس کا عنوان ''انسان موجود ناشناختہ'' (یعنی انسان کہ جسے آج تک پہچانا نہیں جاسکا) رکھا ہے۔

کیا انسانی روح، اس کے میلانات، غرائز اور اسکے لطیف جذبات کو مکمل طور پر پہچان لیا گیا ہے؟

کیا انسان کی جسمی اور روحی ضروریات کو خدا کے علاوہ کوئی ہستی جانتی ہے؟

کیا آپ عام انسانوں کے درمیان کسی ایسے شخص کو تلاش کرسکتے ہیں کہ جس کے اس معاشرے سے کسی بھی قسم کے فوائد منسلک نہ ہوں؟

کیا کوئی ایسا شخص جو ہر قسم کی خطا اور اشتباہ سے پاک اور انسان و معاشرے کے تمام مسائل اور احتیاجات سے مکمل آگاہ ہو کیا آپ اسے ان عام انسانوں میں ڈھونڈ سکتے ہیں؟

لھذا خدا اور وہ شخص جو وحی کے ذریعہ خدا سے ارتباط رکھتا ہو ان کے علاوہ کوئی بھی شخص مکمل اور بہترین قانون ساز نہیں ہوسکتا۔

لھذا ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خدا نے جب انسان کو کمال کے تمام مراحل طے کرنے کیلئے پیدا کیا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس کی ہدایت کیلئے ایسے افراد کو معمور فرمائے جو تمام الٰہی و آسمانی قوانین کی تعلیم انسان کو دے سکیں اور جب انسان جان لیں گے کہ فلاں قانون خدا کا قانون ہے تو وہ زیادہ اعتماد اور اطمینان کیساتھ اس پر عمل کرسکیں گے بالفاظ دیگر یہ آگاہی اس بات کی ضامن ہے کہ ان قوانین پر زیادہ سے زیادہ عمل کیا جائے گا۔

توحید اور نبوت کے درمیان رابطہ

اس نکتے کی طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ نظام خلقت بذات خود الٰہی پیغمبروں کے وجود اور ان کی رسالت پر ایک زندہ گواہ ہے۔

اگر ہم اس کائنات کے حیرت انگیز نظام پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خدا نے تمام موجودات کی ضروریات کا اپنے لطف و کرم کے ساتھ خیال رکھا ہے مثلاً اگر ہمیں دیکھنے کیلئے آنکھیں دی ہیں تو ان کی حفاظت اور روشنی کو مناسب اور صحیح منعکس کرنے کیلئے پلکیں بھی عطا کی ہیں۔

آنکھوں کے گوشوں میں آنسو کے غدود پیدا کیے تا کہ ان کی سطح کو مرطوب رکھیں کیونکہ آنکھوں کا خشک ہونا ان کے ختم ہونے کا باعث بنتا ہے اور پھر آنکھوں کے اندر انتہائی باریک سوراخ بنائے تا کہ اضافی پانی کو ناک کے اندر گرا سکیں اگر یہ باریک سوراخ نہ ہوتے تو وہ آنسوؤں کے مسلسل قطرے ہمارے چہرے پر بہتے رہتے، آنکھ کی پتلی کو اس قدر حساسیت عطا کی کہ وہ خود بخود تیز یا کمزور روشنی کے مقابلے میں تنگ یا کشادہ ہو جاتی ہے تا کہ حسب ضرورت روشنی آنکھ میں پہنچے اور آنکھ کو صدمہ نہ پہنچے، آنکھ کے دائرے کے اطراف میں ایسے مختلف عضلات بنائے کہ سر اور جسم کو حرکت دیئے بغیر آسانی کے ساتھ آنکھ کو ہر طرف گھما کر دیکھا جا سکتا ہے۔

ایک ایسا خدا جو انسان کی ضروریات کا اس قدر خیال رکھتا ہے کیا ممکن ہے کہ وہ انسان کو ایک ایسے معصوم اور قابل اطمینان رہبر و راہنما سے محروم رکھے کہ جو خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل کرتا ہو؟!

مشہور و معروف فلسفی بوعلی سینا، اپنی مشہور کتاب ''شفا'' میں تحریر فرماتے ہیں:

انسان پلکوں، ابرو اور پاؤں کے درمیان خالی جگہ کا اتنا محتاج نہیں ہے کہ جتنا اپنی بقاء اور کمالات کے حصول کیلئے انبیاء کی بعثت کا محتاج ہے لھذا یہ ممکن نہیں ہے کہ خداوند متعال ایک ضروری چیز کو تو پیدا کرے لیکن اس سے زیادہ لازمی چیز کو پیدا نہ کرے!

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟

۲) انسان قانون کے بغیر زندگی کیوں نہیں گذار سکتا؟

۳) ایک واضح اور روشن مثال کے ذریعے ثابت کریں کہ انسانی زندگی کیلئے کسی قانون اور ضابطے کی کیا اہمیت ہے؟

۴) ایک اچھے قانون ساز کیلئے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟

۵) انبیاءؑ کا انسانوں میں سے ہی ہونا کیوں ضروری ہے؟

تیسرا سبق

انبیاءؑ کیوں معصوم ہیں؟

گناہ اور خطاء سے پاک ہونا

بلا شک وشبہہ ہر نبی کیلئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگوں کا یوں اعتماد حاصل کرے کہ اس کی گفتار میں کسی بھی قسم کے جھوٹ یا خطاء کا شائبہ تک نہ رہے وگرنہ اس کی رہبری ور رہنمائی متزلزل ہوجائے گی۔

اگر انبیاءؑ معصوم نہ ہوں تو بہانہ باز قسم کے لوگ "اس وجہ سے کہ انبیاء غلطی کرتے ہیں" اور حقیقت کے متلاشی افراد انبیاء کے دعویٰ میں متزلزل ہونے کی وجہ سے یا تو ان کی دعوت پر لبیک نہیں کہیں گے یا کم از کم گرمجوشی سے اسے قبول نہیں کریں گے۔

اس دلیل کو ہم "دلیل اعتماد" کا نام دے سکتے ہیں اور یہ دلیل عصمت انبیاء کے دلائل میں سے ایک اہم ترین دلیل ہے۔

بالفاظ دیگر: یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال ایسے شخص کی اطاعت کا حکم دے جو کسی شرط اور قید کے بغیر ہو اور عین ممکن ہے خطا کار ہو یا گناہ کا ارتکاب کرے، کیا ایسی صورت میں لوگ اس کی اطاعت کر سکتے ہیں؟

اگر اطاعت کریں گے تو گویا انہوں نے خطاء اور گناہ کی اتباع کی، اور اگر نہ کریں تو انھوں نے رہبری کے مقام کو تسلیم نہیں کیا خصوصاً اس وجہ سے کہ انبیاء کی رہبری کا مقام دیگر افراد سے مکمل طور پر مختلف ہے کیونکہ لوگ اپنا عقیدہ اور زندگی کے رہنما اصول انھیں انبیاء سے ہی لیتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب بڑے بڑے مفسران قرآن اس آیہ مبارکہ:

"اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم" (نساء آیت ۵۹)

خدا کی اطاعت کرو رسول خدا اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں بغیر کسی شرط اور قید کے اطاعت کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ ناصرف انبیاء معصوم ہیں بلکہ اولی الامر بھی معصوم ہیں اور اولی الامر سے مراد نبی اکرم کی طرح معصوم آئمہ ہیں ورگرنہ خداوند متعال ہرگز بغیر کسی قید اور شرط کے ان کی اطاعت کا حکم نہ دیتا۔

ایک اور طریقے سے بھی ہم انبیاء کا ہر گناہ سے پاک و معصوم ہونا ثابت کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ "انبیاءؑ میں ہر قسم کے گناہ کے عوامل شکست خوردہ ہیں"۔

یعنی جب ہم اپنے نفوس کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم بعض گناہوں اور برے و ناپسندیدہ کاموں کے مقابلے میں تقریباً معصوم ہیں۔

زیادہ وضاحت کیلئے درج ذیل مثالوں میں غور فرمائیں:

کیا آپ کوئی ایسا عقل مند آدمی تلاش کر سکتے ہیں جو آگ کو کھانے کیلئے فکر مند ہو؟ یا کوڑا کرکٹ اور گندگی چبانے کی فکر میں ہو؟

کیا کوئی ایسا باشعور انسان تلاش کیا جا سکتا ہے جو مکمل طور پر برہنہ ہو کر گلیوں اور بازاروں میں گھومے؟

یقیناً جواب نفی میں ہوگا اور اگر کسی کو ایسا کام کرتے ہوئے دیکھیں گے تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ وہ نارمل انسان نہیں ہے اور کسی نفسیاتی بیماری کا شکار ہو کر اپنی عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے ورگرنہ کسی عقل مند انسان سے ایسا اقدام محال ہے۔

جب ہم اس قسم کے حالات و واقعات کے متعلق غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان عادات و اعمال کا غیر معقول اور پست ہونا اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی شخص ان کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

اب ہم یہاں ایک مختصر جملے کے ذریعے اس حقیقت کو مجسم کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ہر عقل مند اور صحیح و سالم شخص بعض برے اور ناشائستہ کاموں کے مقابلہ میں "محفوظ" یا بالفاظ دیگر "عصمت" رکھتا ہے۔

اس سے کچھ آگے بڑھتے ہیں، انسانوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان ناشائستہ کاموں سے اس قدر پرہیز کرنے والے ہیں کہ عام انسان اس قسم کی احتیاط سے عاری ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک ماہر طبیب جو کہ جراثیم (Microbe) کی مختلف اقسام سے واقف ہے کبھی بھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوگا کہ وہ ایک ایسا پانی پیے جو کہ خطرناک قسم کے جراثیموں سے آلودہ ہو جبکہ ایک ان پڑھ اور جاہل انسان اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔

اس سادہ سے تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی علمی سطح اور آگاہی جتنی بڑھے گی اتنا ہی زیادہ وہ خطا و اشتباہ سے محفوظ رہے گا۔

پس اس حساب سے اگر کوئی شخص ایمان اور معلومات کے اعتبار سے جتنا زیادہ بلند ہوتا چلا جائیگا اور خدا اور اس کی عدالت پر اعتقاد کا عالم یہ ہوگا کہ گویا وہ ان دونوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر و ناظر دیکھ رہا ہوگا تو یقیناً وہ اپنے آپ کو تمام گناہوں سے محفوظ رکھے گا اور ہر برا عمل اس کے نزدیک ایسے ہی ہوگا جیسے ہماری نظر میں بازار میں مادرزاد ننگا گھومنا۔

اس کے نزدیک حرام مال ایسے ہی آگ کا شعلہ ہوگا جیسے ہمارے نزدیک حقیقی آگ کہ جسے ہم اپنے منہ کی طرف نہیں لے جاتے وہ بھی حرام مال کو اپنے منہ کی طرف نہیں لے جائے گا۔

اس تمام گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ انبیاء اپنے علم و آگاہی اور کامل ایمان کی وجہ سے گناہوں کے تمام عوامل کو کنٹرول میں کر لیتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں گناہ کا خواہ کتنا ہی بڑا عامل پیش آئے ان کی عقل و ایمان پر حاوی نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ انبیاء معصوم ہیں اور گناہوں سے منزہ و مبرا ہیں۔

عصمت کا مقام کیسے باعث فضیلت ہوسکتا ہے؟

بعض ایسے لوگ جو کہ عصمت کے مفہوم اور گناہوں سے بچانے والے عوامل سے آگاہ نہیں ہیں وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر خدا کسی کو گناہ سے روک دے اور اس میں ہر قسم کے گناہ کے عوامل ختم کردے تو یہ چیز اس شخص کیلئے باعث فضیلت نہیں ہے! یہ ایک اجباری عصمت ہے اور زبردستی کی عصمت کو کسی بھی قسم کی فضیلت شمار نہیں کیا جاسکتا، لیکن جو توضیحات ہم ذکر کرچکے ہیں ان سے اس اعتراض کا جواب واضح ہوجاتا ہے کہ: انبیاء کی عصمت میں کسی بھی قسم کا اجباری پہلو نہیں پایا جاتا بلکہ ان کا انتہائی قوی ایمان و کامل یقین،

آگاہی و شناسائی اور فوق العادۃ علم اس بات کا موجب بنا ہے کہ عصمت کی ایک عظیم فضیلت انہیں حاصل ہوئی ہے۔

اگر باہوش اور آگاہ طبیب بیماری کے تمام عوامل سے شدت کے ساتھ پرہیز کرے تو کیا یہ اس کے مجبور ہونے کی دلیل ہے؟

اگر کوئی صحت کے اصولوں کا اس حد تک خیال رکھے تو کیا یہ اس کی فضیلت شمار نہیں ہوگی؟

اگر ایک قانون فہم شخص کسی جنایت کے عدالت میں ہولناک نتائج کو جانتے ہوئے اس سے سختی سے پرہیز کرتا ہے تو کیا یہ اس کی فضیلت شمار نہیں ہوگی؟

پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء کا معصوم ہونا نا صرف ان کے اختیار میں ہے بلکہ ان کیلئے ایک بہت بڑی عظمت بھی ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) معصوم ہونے کی کتنی اقسام ہیں؟

۲) اگر انبیاء معصوم نہ ہوتے تو کیا مشکلات پیش آسکتی تھیں؟

۳) عصمت کا حقیقی مقام کیا ہے؟

۴) سبق میں مذکورہ مثالوں کے علاوہ ایسی مثالیں ذکر فرمائیں کہ جن میں تمام افراد یا بعض افراد معصوم ثابت ہوسکیں؟

۵) انبیاء کی عصمت اجباری ہے یا اختیاری؟ دلیل پیش کریں؟

چوتھا سبق

پیغمبر کی شناخت کا بہترین راستہ

بلاشک وشبہہ ہر مدعی کے دعویٰ کو قبول کرنا عقل اور منطق کے خلاف ہے۔

خداوندمتعال کی طرف سے نبوت ورسالت کا دعویٰ کرنے والا شخص ممکن ہے کہ سچا ہو، لیکن یہ احتمال اپنی جگہ موجود ہے کہ فرصت طلب اور دغاباز قسم کا انسان سچے انبیاءؑ کی جگہ لینے کی کوشش کرے لھذا ضروری ہے کہ ایک ایسا یقینی وقطعی معیار ہمارے پاس ہونا چاہیئے کہ جس کے ذریعے انبیاءؑ کے دعویٰ کی حقیقت اور ان کا خدا سے رابطہ ہمیں معلوم ہوسکے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ہمارے پاس مختلف راستے ہیں جن میں سے دواہم راستے درج ذیل ہیں:

۱) پیغمبرؐ کے دعویٰ سے متعلق دقیق تجزیہ اور اسکی حقیقت پر مختلف قرائن کی جمع آوری۔

۲) معجزہ اور خارق عادہ کام۔

ہم پہلے معجزے کے متعلق گفتگو کرتے ہیں کہ:

بعض ایسے افراد بھی موجود ہیں جو ''معجزہ'' کا لفظ سن کر تعجب کرتے ہیں یا معجزات کو کوئی قصہ کہانی یا افسانہ سمجھتے ہیں حالانکہ اگر معجزہ کے دقیق علمی معنی پر غور وفکر کیا [illegible]

تصورات اشتباہ محض کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

معجزہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ جو غیر ممکن یا کسی علت کے بغیر ہو بلکہ سادہ الفاظ میں معجزہ اس خارق عادت عمل کا نام ہے کہ جو عادی و معمولی افراد کی قدرت میں نہیں ہوتا بلکہ معجزہ طبیعت سے مافوق طاقت کے ذریعے ہی امکان پذیر ہے۔

اسی لیے معجزہ کیلئے درج ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

۱) ایسا کام جو ممکن اور قابل قبول ہو۔

۲) عام یا صاحب کمال انسان صرف انسانی طاقت کے ذریعے اس کو انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔

۳۔ معجزہ لانے والا شخص اپنے کام سے متعلق اتنا مطمئن ہو کہ دوسروں کو مقابلے کی دعوت دے سکے۔

۴) کوئی بھی شخص اس جیسا کام نہ کر سکے جیسا کہ معجزے کے نام سے واضح ہے کہ تمام افراد اس کے مقابلے میں عاجز ہو جائیں۔

۵) ضروری ہے کہ معجزہ دعویٰ نبوت یا امامت کے مطابق ہو "لھذا وہ خارق عادت کام جو انبیاءؑ اور ائمہ کے علاوہ دیگر افراد انجام دیتے ہیں انھیں معجزہ کی بجائے "کرامت" کہا جاتا ہے۔

چند روشن نمونے

ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں سے ایک معجزہ مردوں کو زندہ کرنا اور نا قابل علاج مریضوں کو صحت یاب کرنا تھا۔

کیا ہمارے پاس کوئی ایسی علمی اور عقلی دلیل موجود ہے کہ انسان کے جسم سے جب روح خارج ہو جاتی ہے تو دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ نہیں سکتا؟

کیا ہمارے پاس ایسی علمی اور عقلی دلیل موجود ہے کہ سرطان کی بیماری کیلئے کوئی علاج نہ ہو؟ حالانکہ ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے! البتہ بغیر کسی شک وشبہ کے موجودہ زمانے کی تمام تر ترقی کے باوجود انسان اب تک مردوں کو زندہ کرنے یا بہت سی بیماریوں کے علاج سے عاجز ہے چاہے دنیا کے تمام ڈاکٹر مل کر اپنے تجربات اور معلومات سے مدد ہی کیوں نہ لیں۔

لیکن دوسری طرف کوئی مانع نہیں ہے کہ ایک انسان الٰہی قوت اور علم خدا کے بیکران سمندر سے خصوصی آگاہی کے بعد ایک مخفی اشارے کے ذریعے بھی روح کو واپس جسم میں لا سکتا ہے اور لا علاج مریضوں کو شفا بخش سکتا ہے!

علم تو یہی کہتا ہے کہ نہ تو ہمیں معلوم ہے اور نہ ہی ہم اس کی طاقت رکھتے ہیں لیکن علم اس کام کو ناممکن اور غیر معقول قرار نہیں دیتا۔

دوسری مثال:

چاند کا سفر ایک خلائی جہاز کے بغیر کسی بھی انسان کیلئے ممکن نہیں ہے لیکن کوئی مانع نہیں ہے کہ ہماری طاقت سے زیادہ طاقتور اور ہمارے سائنسی آلات و خلائی جہازوں سے زیادہ دقیق آلات کسی کی دسترس میں ہوں اور وہ ان خلائی جہازوں کی مدد کے بغیر ہی چاند یا دوسرے ستاروں پر پہنچ جائے۔

دراصل اگر کوئی شخص اس قسم کے خارق عادت کام انجام

کا بھی دعویٰ کرے اور لوگوں کو بھی اپنے مقابلے پر بلائے لیکن لوگ اس کے مقابلے سے عاجز ہوں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے۔

کیونکہ ممکن نہیں ہے کہ خداوند متعال ایک جھوٹے شخص کو اتنی قدرت اور طاقت عطا کردے کہ وہ اس کے بندوں کی گمراہی کا باعث بنے۔

معجزات کو خرافات سے نہیں ملانا چاہیئے

افراط اور تفریط ہمیشہ فساد و تباہی اور حقیقت کا چہرہ بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں، معجزہ سے متعلق بھی یہ بات صادق آتی ہے، حالانکہ بعض روشن فکر ہونے کے دعویدار افراد واضح طور پر یا اشارے و کنایے کے ساتھ ہر قسم کے معجزے کا انکار کرتے ہیں جبکہ لوگوں کا ایک اور گروہ زیادہ سے زیادہ معجزات کو تخلیق کرنے کی فکر میں رہتا ہے ضعیف خبروں اور منحرف کر دینے والے افسانوں (کہ جو بعض اوقات دشمن کی طرف سے پھیلائے گئے ہوتے ہیں) کو معجزات سے خلط ملط کر دیتا ہے اور حقیقی پیغمبروںؑ کے علمی معجزات کو اپنے بنائے ہوئے افسانوں اور توہمات کا لباس پہنا دیتا ہے۔

جب تک حقیقی معجزات اس قسم کے جعلی افسانوں سے منزہ نہ ہو جائیں تو اس وقت تک ان کا اصلی چہرہ آشکار نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگ علماء نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ معجزات سے متعلق اسلامی احادیث کو ان افسانوی باتوں سے بچایا جا سکے۔

اسی مقصد کیلئے "علم رجال" وجود میں آیا تا کہ احادیث کے راویوں کو اچھے طریقے سے پہچانا جا سکے اور صحیح و ضعیف احادیث کو الگ الگ کیا جا سکے تا کہ توہمات حقائق سے نہ مل جائیں۔

استعماری اور الحادی قوتوں کی آج بھی یہ کوشش ہے کہ وہ ان بے سروپا باتوں کو صحیح دینی اعتقادات سے مخلوط کر دیں اور اس طریقے سے تمام افراد کو حقیقی علم سے دور کر دیا جائے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم دشمن کی ان تخریبی سازشوں سے مکمل طور پر آگاہ رہیں۔

معجزہ کا دوسری خارقِ عادت چیزوں سے فرق

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ بعض شعبدہ باز بعض اوقات خارقِ عادت کام کرتے ہیں بہت سے لوگوں نے یہ عجیب و غریب کام دیکھے بھی ہوں گے یہ افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ آخر ان خارقِ عادت کاموں اور انبیاءؑ کے معجزات میں کیا فرق ہے اور ہمارے پاس ان کی تشخیص کا معیار کیا ہے؟!

اس سوال کے دو واضح جواب یہ ہیں:

۱) اس قسم کے لوگ ہمیشہ محدود کام انجام دیتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی شخص اس بات کیلئے آمادہ نہیں ہوگا کہ آپ کی خواہش کے مطابق خارقِ عادت کام انجام دے بلکہ وہ صرف ایسا ہی کام انجام دے گا کہ جس کی اس نے بہت زیادہ مشق یا ریاضت کی ہو، اس بات کی دلیل واضح ہے کیونکہ ہر انسان کی طاقت محدود ہے اور وہ صرف ایک یا چند کاموں میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن انبیاءؑ کے خارقِ عادات کام بغیر کسی قید و شرط کے ہیں یعنی لامحدود ہیں وہ کسی بھی طلب کردہ معجزے کو انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں کیونکہ وہ خدا کی بے پناہ قدرت و طاقت سے مدد حاصل کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کی قدرت تمام

خارج ہے، جبکہ انسان کی قوت وقدرت بہت ہی محدود ہے۔

۲) ایک شعبدہ باز کا انجام دیا گیا کام دوسرا شعبدہ باز بھی انجام دے سکتا ہے یعنی وہ کام بشر کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک شعبدہ باز خارق عادۃ کام کرنے کے باوجود مقابلے کی دعوت نہیں دیتا یعنی کسی کو چیلنج نہیں کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسی شہر وقریہ میں یا کسی دوسرے شہر میں اس جیسے دیگر افراد بھی موجود ہیں لیکن انبیاءؑ مکمل اطمینان کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں اور کہتے ہیں" اگر زمین کے تمام انسان بھی جمع ہو جائیں تو مجھ جیسا کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے"

یہی فرق سحر اور جادو پر بھی صادق آتا ہے اور بیان کردہ دونوں باتوں کے بعد ہم معجزہ اور جادو کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) معجزہ کو معجزہ کیوں کہتے ہیں؟

۲) کیا معجزہ علّیت کے قانون سے مستثنیٰ ہے؟

۳) کن طریقوں سے ہم معجزہ کو شعبدہ بازوں کے عمل اور جادو سے جدا کر سکتے ہیں۔

۴) معجزہ کی اصلی شرائط کیا ہیں؟

۵) کیا آپ نے آج تک معجزہ جیسی کوئی چیز دیکھی ہے؟

پانچواں درس

پیغمبر اسلامؐ کا سب سے بڑا معجزہ

تمامی اسلامی دانشمندوں کا اس پر اعتقاد ہے کہ قرآن پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ سب سے بڑا اس لیے کہ:

۱) قرآن ایک ایسا عقلی معجزہ ہے جو عام لوگوں کی فکر و روح کے مطابق ہے۔

۲) قرآن مجید ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے۔

۳) قرآن ایک ایسا معجزہ ہے کہ چودہ سو سال گذرنے کے باوجود پکار پکار کر کہہ رہا ہے "اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ آسمانی کتاب خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی نہیں ہے تو اس جیسی لے آئیں"!

اس قسم کے چیلنج کو جسے "تحدی" کہا جاتا ہے، قرآن مجید نے چند جگہ پر واضح طور پر دیا ہے ایک جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

"قل لئن اجتمعت الانس و الجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ و لو کان بعضھم ببعض ظھیرا" (اسراء آیت ۸۸)

کہہ دیجیے اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل نہیں لاسکیں گے......

ایک اور جگہ میں قرآن مجید مقابلہ کی دعوت کو آسان کر کے فرماتا ہے:

"ام یقولون افتراہ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات و ادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین" (ہود آیت ۱۳)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے "قرآن کو" خود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے اگر تم سچے ہو تو اس جیسی خود ساختہ دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے سواء جس جس کو بلا سکتے ہو بلاؤ۔

اسکے بعد مزید فرماتا ہے کہ اگر یہ دعوت قبول نہ کریں تو جان لیجیے کہ یہ آیات خدا کی طرف سے ہیں (سورہ ہود آیت ۱۴)

ایک اور آیہ مبارکہ میں اللہ تعالی نے مقابلے کی شرائط کو کم کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

"و ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ و ادعوا شھدائکم من دون اللہ ان کنتم صادقین" (سورہ بقرہ آیت ۲۳)

پس یہ کتاب (قرآن) جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے اس میں اگر آپ کو شک ہے تو کم از کم اس سورۃ جیسی ایک سورۃ تو لائیں پس خداوند متعال کے علاوہ اپنے گواہوں (اور منکرین) کو لائیں اگر تم سچ کہتے ہو۔

اسکے بعد والی آیہ مبارکہ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ:

اگر وہ "یعنی کفار" اس کام کو انجام نہ دے سکے اور وہ ہرگز اس کام کو انجام نہیں دے سکتے، تو پس کہہ دیجیے کہ وہ اس آگ سے اپنے آپ کو بچائیں کہ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

قرآن نے انکار کرنے والوں کو مسلسل مقابلہ کرنے کی دعوتیں دی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر خداؐ معجزہ کے مسئلے میں زیادہ تر قرآن ہی پر بھروسہ کرتے تھے اگر چہ اس کے علاوہ چند اور معجزات بھی پیغمبر خداؐ سے نقل ہوئے ہیں اور تاریخ کی کتابوں میں ان کا ذکر ہوا ہے۔

پس چونکہ قرآن ایک زندہ معجزہ ہے اور تمام لوگوں کو اس تک پہنچنے میں کوئی مانع درپیش نہیں ہے لھذا اہم معجزات کی بحث میں "قرآن" کا ذکر ہی کافی سمجھتے ہیں۔

سب لوگ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو گئے تھے؟ جالب نکتہ یہاں ہے کہ قرآن مجید نے مخالفین کے میدان مقابلہ میں آنے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور مختلف ابھارنے والی عبارتوں سے انکو دعوت دی ہے تا کہ کسی کیلئے کوئی عذر نہ رہ جائے جیسے:

اگر آپ سچے ہیں؟ آپ ہرگز نہیں کر سکتے؟...... تمام لوگوں سے مدد لے سکتے ہیں؟ کم از کم اس سورۃ جیسی ایک سورۃ لائیں، اگر آپ انکار کریں گے تو آگ جو جلا دینے والی ہے وہ آپ کے انتظار میں ہے" یہ سب جملے اس واقعیت کو بیان کر رہے ہیں۔

البتہ یہ تمام چیزیں ایک طرف ہیں اور دوسری طرف پیغمبر خداؐ کا اپنے مخالفین کے ساتھ مقابلہ کرنا معمولی بات نہیں تھی اس لیے کہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ ان کے مذہب "کہ جس پر وہ سختی سے عمل کرتے تھے" کو خطرے میں ڈال دیا تھا بلکہ انکے اقتصادی اور سیاسی منافع بھی خطرے میں آ گئے تھے، بالفاظ دیگر اسلام کے نفوذ اور ترقی نے ان کی

تمام تر زندگی کو درہم برہم کر دیا تھا لھذا وہ مجبور تھے کہ اپنی تمام تر طاقت اور قدرت کے ساتھ میدان میں آ جائیں۔

انہیں چاہیے تھا کہ تمام تر کوشش اور امکان کے ساتھ پیغمبر اسلام کو جواب دینے کیلئے قرآن جیسی چند آیات لے آتے تا کہ نہ تو قرآن دوبارہ انہیں چیلنج کرتا اور نہ انہیں اپنے مقابل عاجز شمار کرتا اور نہ اس چیز کو اپنی حقانیت پر سند شمار کرتا۔

انھوں نے تمام ان لوگوں سے مدد طلب کی تھی جو اس زمانے کے فصیح و بلیغ لوگ تھے لیکن ہر دفعہ جب وہ قرآن مجید کے مقابلے میں آئے تو انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے تاریخ کی کتابوں میں سب کچھ تفصیل سے مذکور ہے۔

ولید بن مغیرہ کی کہانی

وہ لوگ جو قرآن مجید کے ساتھ مقابلہ کرنے کیلئے بلائے گئے تھے ان میں ولید بن مغیرہ بھی شامل تھا کہ جسکا کا تعلق قبیلہ بنی مخزوم سے تھا کہ یہ قبیلہ اس زمانے میں عربوں کے درمیان اچھی تدبیر اور عمدہ فکر سے مالا مال تھا۔

لھذا کفار نے اس سے یہ درخواست کی کہ اس چیز کے بارے وہ غور و خوض کرے اور قرآن مجید کی حیرت انگیز اور خارق عادت حد تک نفوذ کرنے والی آیات کے بارے اپنا نظریہ بیان کرے۔

ولید بن مغیرہ نے پیغمبر خداؐ سے درخواست کی کہ قرآن مجید کی کچھ آیات تلاوت فرمائیں پیغمبر اسلامؐ نے کچھ آیات سورۃ مبارکہ "حم سجدہ" سے تلاوت فرمائیں، پس ان آیات کا سننا تھا کہ ولید بن مغیرہ کے دل میں ہیجان و اضطراب پیدا ہوا کہ وہ بے اختیار اپنی

جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بنی مخزوم کی قائم کردہ محفل میں جا پہنچا اور اس نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ محمد سے میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ جو نہ انسانوں کی گفتار اور نہ جنوں کے کلام کے مانند ہے اور اس کے بعد یہ ولید بن مغیرہ نے اس طرح کہا:

"و ان لہ لحلاوۃ و ان علیہ لطلاوۃ و ان اعلاہ لمثمر و ان اسفلہ لمغدق و انہ یعلو و لا یعلی علیہ"

''اس کی گفتار میں مخصوص مٹھاس تھی اور کلام میں ایک خاص قسم کی ایسی خوبصورتی تھی جیسے ایک توانا درخت پر پھل دار ٹہنیاں ہوں اور وہ مضبوط اور محکم کلام ہے جو ہر چیز سے بلند تر ہے اور کوئی بھی چیز اس کلام سے بلند نہیں ہو سکتی۔

ولید بن مغیرہ کا یہ کہنا تھا کہ قریش کے درمیان آہستہ آہستہ یہ شک پڑنا شروع ہو گیا کہ ولید بن مغیرہ محمد کا چاہنے والا ہو گیا ہے! ابو جھل جلدی میں ولید بن مغیرہ کے گھر پہنچا اور قریش کی یہ بات کہ ولید بن مغیرہ محمد کا چاہنے والا ہو گیا ہے'' اسے کہی اور اس کو دوبارہ قریش کی محفل میں آنے کی دعوت دی۔

ولید بن مغیرہ قریش کی محفل میں دوبارہ پہنچا اور اس نے قریش سے کہا:

۱) کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دیوانہ ہے؟

۲) کیا آپ نے واقعاً آثار دیوانگی اس میں ملاحظہ کیے ہیں؟

حاضرین محفل نے نفی میں جواب دیا پھر ولید بن مغیرۃ نے کہا کہ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے؟ مگر وہ آپ کے درمیان سچا اور امین مشہور نہیں تھا؟!

قریش کے بعض سرداروں نے ولید بن مغیرہ سے پوچھا کہ اس کی طرف کونسی نسبت دینی چاہیے؟ ولید بن مغیرہ نے تھوڑی سی فکر کرنے کے بعد کہا کہ آپ اس کو ''ساحر'' کہنا شروع کر دیں!

اگرچہ قریش کا پروگرام یہ تھا کہ اس تعبیر ''ساحر'' سے لوگوں میں سے اس گروہ کو'' جو قرآن مجید کے چاہنے والے تھے'' محمدؐ سے دور کر دیا جائے لیکن یہ تعبیر ''ساحر'' خود اس بات پر ایک زندہ دلیل تھی کہ قرآن مجید فوق عادت جذب کرنے والی کتاب ہے پس انھوں نے اس قوت جاذبہ کا نام سحر رکھ دیا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ قرآن کا دور سے بھی سحر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

قریش نے ہر جگہ یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا کہ محمدؐ زبردست ساحر ہے اور یہ آیات اس کا سحر ہے، اس سے دور ہو جائیں اور یہ کوشش کریں کہ اس کا کلام نہ سنیں! لیکن ان کی یہ ساری کی ساری سازش تمام تر کوشش کے باوجود ناکام ہوئی اور حقیقت کے متلاشی لوگ جو اردگرد کے علاقوں میں رہتے تھے چونکہ ان کے دل پاک تھے اس لیے وہ گروہ گروہ کی شکل میں قرآن کی طرف آنا شروع ہو گئے اور اس پیغام آسمانی کے آب زلال سے سیراب ہونے لگے، دشمن شکست کھا کر ہٹنے لگے۔

آج بھی قرآن مجید دنیا کے تمام لوگوں کو مقابلہ کی دعوت دے رہا ہے اور چیلنج کر رہا ہے کہ اگر تم ان آیات کے بارے میں شک اور تردید کا شکار ہو اور اس کلام کو انسانی ذہن کی اختراع خیال کرتے ہو تو اس جیسا کلام لے آؤ اے ہر قوم و ملت کے دانشور! اے فلاسفہ! اے ادیبو! اے مصنفین!

اس بات سے بھی ہم کاملاً آگاہ ہیں کہ اسلام کے دشمن خصوصاً عیسائی

اسلام کو ایک انقلابی مکتب اور عیسائیت کیلئے مضر اور خطرناک خیال کرتے ہیں ہر سال کروڑوں ڈالر اسلام مخالف تعلیمات پر خرچ کرتے ہیں اور یہ کام مختلف فرہنگی، علمی اور صحت وصفائی کے مختلف پروگراموں کی آڑ میں مختلف اسلامی ممالک میں بڑی تیزی اور منظم طریقے سے کر رہے ہیں (اگر وہ اپنے عقیدہ میں سچے ہیں تو) کیا بہتر ہوتا کہ وہ اپنے عیسائی عربوں، دانشمندوں، شعرا، فلاسفہ اور لکھنے والوں کو اس بات کی دعوت دیتے کہ قرآن کی طرح چند سورتیں تیار کر کے لے آؤ تا کہ انہیں پھیلا کر مسلمانوں کو خاموش کیا جائے۔

یہ طے ہے اگر یہ کام ممکن ہوتا تو عیسائی ایسا ضرور کرتے اس کام کو انجام نہ دینا انکی کمزوری اور شکست اور قرآن کے سچا معجزہ ہونے پر دلیل ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) پیغمبر گرامی کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید کیوں ہے؟

۲) قرآن کس قسم کا چیلنج کر رہا ہے؟

۳) دشمنان قرآن اسکو "سحر" کے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟

۴) قرآن مجید "موجودہ مسیحیت" کا سخت رقیب کیوں ہے؟

۵) "ولید بن مغیرہ مخزومی" کی داستان کیا ہے؟

چھٹا سبق

اعجاز قرآن کے چند دریچوں کی طرف

حروف مقطعات کیوں؟

ہم جانتے ہیں کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا آغاز ''حروف مقطعہ'' جیسے ''الم''، ''الر''، ''یس'' وغیرہ سے ہوا ہے۔

روایات اسلامی کے مطابق ان ''حروف مقطعات'' کا ایک راز اور فلسفہ یہ ہے کہ خداوند عالم ہمیں بتانا چاہتا ہے کہ قرآن مجید جیسا ''بڑا عظیم اور جاودانی معجزہ'' کیسے ان معمولی سمجھے جانے والے حروف ''الف، با'' سے وجود میں آیا ہے اور ایک اتنا بڑا کلام ایسے حروف اور الفاظ سے وجود میں آیا ہے کہ جنکو ایک چند سالہ بچہ بھی پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اتنے اہم عظیم کام کا اس قسم کے مواد سے وجود میں آنا ہی ایک بڑا ''معجزہ'' ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے، کیا صرف فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے؟ یعنی ''عبارت کی شیرینی، تعبیرات کا سریع الانتقال اور غیر معمولی اثر ونفوذ'' یا کسی اور حیثیت سے ''معجزہ'' ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم قرآن کو جس نظر، زاویے اور دریچے سے دیکھیں قرآن ہر اس

اعتبار سے ''معجزہ'' ہے، جیسے:

۱) فصاحت وبلاغت، اسکے الفاظ اور مفاہیم ایک مٹھاس، غیر معمولی کشش اور عجیب و غریب قوت جاذبہ پر مشتمل ہیں۔

۲) ہر نظر سے اعلیٰ ترین راہنما مضامین، خصوصاً تمام خرافات سے پاک عقائد کا بیان۔

۳) معجزات علمی؛ یعنی قرآن نے ان مسائل سے پردہ اٹھایا ہے کہ جن مسائل کی حقیقت تک آج تک انسان نہیں پہنچ سکا تھا!

۴) آنے والے بہت سے مسائل (وواقعات) کی واضح، صحیح اور دقیق پیشین گوئی (قرآن کی غیبی خبریں)۔

۵) کسی قسم کے تضاد، اختلاف، تفرقہ اور پریشان کن باتوں اور ان جیسے دیگر امور سے قرآن کا پاک ہونا۔

مذکورہ بالا پانچ مسائل کے متعلق بحث مفصل وطولانی ہے لیکن ہم ان چند اسباق میں اس تمام بحث کے چند اہم اور جاذب ترین نکات کا تجزیہ کرتے ہیں:

۱) فصاحت وبلاغت

ہم جانتے ہیں کہ ہر کلام کے دو ''پہلو'' ہوتے ہیں ''الفاظ'' اور ''مطالب''

ہر وہ کلام جو موزون، خوشنما الفاظ مناسب، منظم روان کلمات پر مشتمل ہو اور پیچیدہ اور غیر مناسب عبارات سے پاک ہو اور اسکے جملوں کی ساخت معنی ومراد کو کامل صورت میں زیبائی اور جذابیت کے ساتھ بیان کرے تو اسے فصیح وبلیغ کلام کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید بطور اکمل ان دو خوبیوں اور خصوصیات پر مشتمل ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک

کوئی شخص یہ ہمت نہیں کرسکا کہ وہ اس کی آیات یا سورتوں کے مقابلہ میں کوئی ایسا کلام لاسکے جو اسکی طرح پرکشش، جذب کرنے والا، مٹھاس سے بھرپور اور خوبصورت انداز کا حامل ہو۔

گذشتہ سبق میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین عرب کا فاصل اور منتخب شخص "ولید بن مغیرہ" آیات قرآن کو سن کر ہیجان زدہ ہوگیا تھا اور قرآن کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک مدت تک دقیق غور وفکر اور مطالعہ کرتا رہا بالاخر (ناکام ونامراد ہوکر) اس نے سرداران قریش سے کہا کہ وہ (لوگوں سے) کہیں کہ قرآن "سحر" اور محمدؐ "ساحر" ہیں!

مشرکین متعدد مرتبہ سحر وساحر کی نسبت پیغمبر اسلام کی طرف دیتے رہے اگر چہ وہ اس نسبت کے ذریعے پیغمبر اسلام کی "مذمت" کرنا چاہتے تھے مگر درحقیقت وہ آپ کی تعریف وستائش کررہے تھے، کیونکہ یہ نسبت اس بات کا اعتراف تھا کہ "قرآن مجید غیر معمولی اثر ونفوذ رکھتا ہے"!

مشرکین بجائے اسکے کہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اسکے معجزہ ہونے کا اقرار کرتے اور اس پر ایمان لے آتے اسے افسانہ سمجھتے ہوئے گمراہی کا شکار رہے اور اسے "سحر" قرار دیتے رہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے کئی مواقع آئے کہ تندخو اور جھگڑالو قسم کے لوگ جب پیغمبر اسلام کی خدمت میں آتے اور قرآن کی آیات سنتے تو فوراً اپنا مذہب چھوڑ دیتے اور نور اسلام سے انکے دل منور ہوجاتے، یہ واقعات اس چیز کی طرف واضح اشارہ ہیں کہ قرآن مجید کی کشش اور اسکی فصاحت وبلاغت یقیناً ایک معجزہ ہے۔

ماضی بعید کی بجائے موجودہ زمانے کے ماہرین ادبیات عرب کا حال بھی یہی ہے وہ

جتنا بھی زیادہ قرآن پڑھیں اور بار بار پڑھیں نا صرف اس تکرار سے نہیں تھکتے ایک روحانی لذت کا احساس کرتے ہیں۔

قرآن کی تعبیرات بہت دقیق اور منظم، بیان کی پاکیزگی اور متانت، ساتھ ہی ساتھ بہت ہی واضح وآشکار اور وقت ضرورت پر، بہت ہی محکم اور شکست دینے والی ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ نزول قرآن کے زمانہ کے لوگ ادبی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ اور دقیق تھے، یہی وجہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے اشعار آج بھی عربی اشعار کے بہترین نمونے شمار ہوتے ہیں۔

مشہور ہے کہ ہر سال حجاز کے بڑے بڑے ادیب جمع ہوتے تھے اور عکاظ نامی بازار میں جو کہ ایک تجارتی وادبی مرکز تھا، اپنے بہترین اشعار کو پیش کرتے تھے، پھر انکے کلام سے ایک بہترین شعر کا انتخاب کر کے اسے "سال کا بہترین شعر" قرار دیا جاتا اور خانہ کعبہ میں آویزاں کردیا جاتا تھا، پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے زمانے میں ان اشعار کے "سات نمونے" خانہ کعبہ میں موجود تھے اور انہیں "معلقات سبعہ" کہا جاتا تھا۔

لیکن قرآن مجید کے نزول کے بعد قرآن کی فصاحت وبلاغت کے مقابلہ میں انکی حیثیت وفصاحت اس قدر پھیکی پڑگئی کہ بتدریج ان سب اشعار کو نا صرف وہاں سے اتار دیا گیا بلکہ انہیں فراموش بھی کردیا گیا!۔

مفسران قرآن نے مختلف آیات کی عجیب وغریب باریکیوں کی طرف اپنی اپنی علمی صلاحیت کے مطابق اشارہ کیا ہے، آپ بھی ان تفاسیر کی طرف رجوع کر کے ہمارے ذکر کردہ حقائق کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرسکتے ہیں اگر قرآن سے آشنائی ہوتو معلوم ہوگا کہ پیغمبر اسلام کا یہ فرمان ذرہ برابر بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ:

ظاهره انیق و باطنه عمیق لاتحصی عجائبه و لا تبلی غرائبه:

ظاہر قرآن بہت ہی موزون ومزین اور باطن قرآن بہت ہی کامل وعمیق ہے اسکے عجائب ناقابل شمار اور اسکے عجیب نوادر ناقابل زوال ہیں۔

مکتب قرآن کے سب سے بڑے شاگرد حضرت علی نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"فیه ربیع القلب و ینا بیع العلم و ما للقلب جلاء غیره"

قرآن دلوں کیلئے بہار ہے، علم و دانش کے چشمے قرآن سے ابلتے ہیں اور قلوب کیلئے قرآن سب سے بڑا صیقل اور انکو جلا بخشنے والا ہے!

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) قرآن کے حروف مقطعات کا فلسفہ کیا ہے؟

۲) قرآن آیا ایک حیثیت سے معجزہ ہے؟ یا ہر اعتبار سے معجزہ ہے؟

۳) پیغمبر اسلام کو مخالفین کیوں ساحر کہتے تھے؟

۴) فصاحت اور بلاغت کے درمیان کیا فرق ہے؟

۵) "معلقات سبع" کا کس زمانے سے تعلق ہے اور انکا مطلب کیا ہے؟

ساتواں سبق

کائنات کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ

بحث کے آغاز میں ضروری ہے کہ ہم اس معاشرہ کا تہذیب وتمدن کے اعتبار سے تجزیہ کریں کہ جہاں قرآن مجید کا نزول ہوا۔

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز اس زمانہ میں پسماندہ ترین خطہ تصور کیا جاتا تھا اور عصر جاہلیت کے لوگوں کو نیم وحشی یا وحشی اقوام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

عقیدہ کے اعتبار سے وہ لوگ بت پرستی میں غرق تھے اور تمام معاشرے پر پتھر یا لکڑی کے بنائے ہوئے بتوں کا منحوس سایہ پھیلا ہوا تھا، مشہور ہے کہ "کھجور" کے بت بنا کر انکے سامنے دوزانو بیٹھ جاتے انکو سجدہ کرتے اور قحط سالی کے موقعہ پر انہیں کھا جاتے تھے!

لڑکیوں سے نفرت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ انہیں زندہ درگور کر دیتے تھے جبکہ فرشتوں کو "خدا کی بیٹیاں" تصور کرتے تھے! اور خدا کو تو ایک عام انسان کے رتبہ پر لے آتے تھے۔

"توحید پرستی اور وحدانیت" پر سخت حیران ہوتے تھے اور جب حضرت پیغمبر اکرمؐ نے انکو دعوت توحید دی تو وہ نہایت تعجب سے کہنے لگے:

"أجعل الالهة الها واحداً ان هذا لشیئ عجاب" (سورہ ص آیت ۵)

کیا اس نے بہت سے معبودوں کی جگہ صرف ایک معبود بنالیا؟ یہ تو یقیناً بڑی عجیب چیز ہے۔

جو شخص بھی انکی خرافات، جھوٹے افسانوں اور انکے نظریات کے خلاف بات کرتا اسے "دیوانہ" کہہ کر پکارنے لگتے۔

قبائلی نظام اپنی پوری شدت کیساتھ معاشرے پر چھایا ہوا تھا اور قبائلی اختلافات اس قدر شدید تھے کہ ہمیشہ جنگ کی آگ روشن رہتی تھی اور زمین کو ایک دوسرے کے خون سے رنگین رکھتے تھے، قتل وغارتگری ان کا روزانہ کا معمول تھا اور اس پر وہ فخر کرتے تھے۔

اہم مرکزی شہر مکہ میں پڑھے لکھے افراد کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا تھا جبکہ دانشمند اور عالم شاذونادر ہی پائے جاتے تھے۔

اس قسم کے معاشرے سے ایک شخص "کہ جس نے نہ تو اسکول کا رخ کیا تھا اور نہ ہی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے تھے" اٹھتا ہے اور ایک ایسی کتاب لیکر آتا ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی علماء ودانشمند اسکی تفسیر میں مشغول ہیں اور ہر دور میں نئے نئے حقائق کا انکشاف کر رہے ہیں۔

قرآن مجید اس کائنات اور اسکے نظام کا انتہائی دقیق اور منظم نقشہ پیش کرتا ہے۔ "توحید" کا مکمل تعارف بھی قرآن کی زبان سے ہی معلوم ہوتا ہے، زمین وآسمان کی تخلیق کے اسرار ورموز، دن ورات، سورج وچاند، جمادات ونباتات اور انسان کی خلقت، غرض یہ کہ ان تمام اشیاء کو خدا کی نشانیوں اور اسکے وجود مبارک کی دلیلوں کے طور پر اپنی مختلف

آیات میں مختلف انداز تعبیرات اور تشبیہات سے پیش کرتا ہے۔

بعض اوقات وہ انسان کے وجود کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور وہاں سے اٹھنے والی آواز کے ذریعے ثابت کرتا ہے کہ "توحید" اور "یکتا پرستی" انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

"فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین فلما نجّاھم الی البرّ اذا ھم یشرکون" (عنکبوت آیت ۶۵)

وہ جب کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو خلوص کیساتھ پکارتے ہیں پھر جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

اور کبھی عقل و دانائی کے ذریعے استدلال کرتے ہوئے "توحید" کو ثابت کرتا ہے اور اس کائنات اور خود اپنے نفوس میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ زمین و آسمان، حیوانات، پہاڑوں، دریاؤں، بارش کے برسنے، باد نسیم کے جھونکوں اور انسانی جسم و روح کی انتہائی دقیق، منظم اور پیچیدہ تخلیقی اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتا ہے۔

خداوند متعال کی صفات کو انتہائی گہرے لیکن دلکش انداز سے پیش کرتا ہے ایک جگہ فرماتا ہے:

"لیس کمثلہ شیء"

کوئی چیز بھی اسکی مانند نہیں ہے (شوری آیت ۱۱)

جبکہ دوسری جگہ فرماتا ہے:

"ھُوَ اللّٰہُ الذی لا الٰہ الّا ھو عالمُ الغیب و الشھٰدۃ

ھو الرّحمٰن الرّحیم (۲۲) ھُوَ اللّٰہُ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُونَ (۲۳) ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِءُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَہُ مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیزُ الْحَکِیمُ" (۲۴)

(سورہ حشر آیت ۲۲،۲۳،۲۴)

وہی اللہ ہے جسکے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ پنہاں اور آشکار چیزوں کا جاننے والا ہے وہی رحمٰن اور رحیم ہے ☆ وہی اللہ ہے جسکے علاوہ کوئی معبود نہیں وہی بادشاہ ہے، نہایت پاکیزہ، سلامتی دینے والا، امان دینے والا، تسلط قائم رکھنے والا، بڑا غالب آنے والا، بڑی طاقت والا، کبریائی کا مالک ہے، پاک ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ☆ وہی اللہ ہی خالق، پیدا کرنے والا اور صورتگر ہے، جس کے لیے حسین ترین نام ہیں جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

خداوند عالم کے "لامحدود علم" کی توصیف ان دلکش الفاظ میں بیان کرتا ہے: اور اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر کے ساتھ مزید سات سمندر مل (کر سیاہی بن) جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہونگے: (سورہ لقمان آیت ۲۷)

خداوند عالم کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کو ایسی اعلی ترین تعبیرات سے پیش کرتا ہے کہ یہ تعبیرات صرف قرآن کا ہی خاصہ ہو سکتی ہیں۔

"وللّٰہ المشرق و المغرب فاینما تولوا فثم وجہ

اللہ......"(سورہ بقرہ آیت ۱۱۵)

اور مشرق ہو یا مغرب، دونوں اللہ ہی کے ہیں پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے۔

"و ھو معکم این ما کنتم و اللہ بما تعملون بصیر "(حدید آیت ۴)

تم جہاں بھی ہو وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس پر خوب نگاہ رکھنے والا ہے۔

قیامت اور یوم حشر کی بات ہو تو قیامت کا انکار اور تعجب کرنے والے مشرکین کے بارے میں کہتا ہے:

(انسان اپنی خلقت کو بھول کر کہنے لگتا ہے) ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟!

''کہہ دیجئے: انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کی تخلیق کو خوب جانتا ہے''

''وہی خدا جس نے تمہارے لیئے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس سے آگ لگاتے ہو (وہی خدا کہ جس نے پانی کے ہمراہ آگ کے شعلہ کو وجود بخشا ہے اس بات پر بھی قادر ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرے)۔

''جس نے آسمانوں اور زمین کو (اس تمام تر عظمت کیساتھ) پیدا کیا ہے آیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کرے؟ کیوں نہیں! وہ تو بڑا خالق (اور) دانا ہے''۔

(اسکی قدرت کا تو یہ عالم ہے کہ) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے (اس قدرت کے بالمقابل انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا، بہت ہی آسان اور معمولی بات ہے) (سورہ یس آیات ۷۸ تا ۸۲)

قرآن لوگوں کے اعمال کے بارے میں یوں کہتا ہے:

"یومئذ تحدث اخبارھا بان ربک اوحی لھا"
(سورہ زلزال آیت ۴،۵)

اس (خوفناک) دن وہ (زمین) اپنے حالات بیان کرے گی، کیونکہ اسکے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔

اور کبھی ہاتھ، پاؤں اور بدن کی سخت جلد کی گواہی کا تذکرہ بھی قرآن صراحت کیساتھ کرتا ہے:

"الیوم نختم علی افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم"(یس آیت ۶۵)

آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور انکے پاؤں گواہی دیں گے (اس کے بارے میں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں)

و قالوا لجلودھم لم شھدتم علینا، قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شیء......(سورہ فصلت آیت ۲۱)

''تو وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ جواب دیں گے اسی اللہ نے ہمیں گویائی عطا کی جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے''......(تا کہ ہم حقائق بتا سکیں)

قرآن مجید کے معارف کی قدر و قیمت اور اسکے مضامین کی عظمت اور ان مضامین کا ہر قسم کی خرافات سے پاک ہونا اس وقت زیادہ واضح ہوجاتا ہے جب ہم اسکا مقایسہ ''تحریف شدہ تورات اور انجیل'' سے کرتے ہیں مثلاً:

تورات حضرت آدمؑ کی خلقت کے بارے میں کیا کہتی ہے اور قرآن کیا کہتا ہے؟ انبیاء کے واقعات اور داستانیں تورات کس انداز میں پیش کرتی ہے اور قرآن کا انداز بیان کیسا ہے؟

تورات اور انجیل خدا کو کن صفات کیساتھ متصف قرار دیتی ہیں اور قرآن خداوند متعال کی توصیف کیسے بیان کرتا ہے؟

اگر ہم یہ اور ان جیسے دیگر سوالات کے جواب ان کتابوں سے تلاش کریں تو انکے درمیان فرق واضح ہوجاتا ہے۔(۱)

---

۱) مزید وضاحت کیلئے ''رہبران بزرگ'' نامی فارسی کتاب کا مطالعہ کریں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) وہ محیط جس میں قرآن نازل ہوا اس معاشرہ کی خصوصیات بیان کریں؟

۲) سرزمین حجاز کے اپنے والوں کے افکار پر بت پرستی کے اثرات کیا تھے؟

۳) ''توحید فطری'' اور ''توحید استدلالی'' کے درمیان فرق واضح کریں؟

۴) پروردگار عالم کی معرفت اور اسکی صفات کے بارے میں قرآن مجید کے انداز تخاطب کے چند نمونے بیان کریں۔

۵) کس طریقے سے قرآن مجید اور اسکے مضامین کی خصوصیات کا بہتر احاطہ کیا جاسکتا ہے؟

آٹھواں سبق

قرآن اور جدید علمی انکشافات

بلاشک وشبہ قرآن مجید علوم طبیعیات (Physics) یا طب (Medical) یا علم نفسیات (psychology) یا علوم ریاضی کی کتاب نہیں ہے۔

قرآن مجید ایک انسان ساز اور ہدایت دینے والی کتاب ہے اور ہر وہ چیز جو اس ہدف کیلئے ضروری ہے اس میں موجود ہے۔

ہمیں قرآن مجید کو مختلف علوم کا دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا (Encyclopaedia) سمجھنے کی بجائے اس سے ایمان و ہدایت کا نور، تقوی و پرہیزگاری، انسانیت واخلاق اور نظم وضبط کے قوانین اخذ کرنے چاہئیں اور یہ تمام چیزیں قرآن مجید میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

لیکن قرآن مجید میں علوم طبیعات کے مسائل اور اس کائنات کے حسن واسرار و رموز کو جاننے کیلئے بھی مختلف اشارے اور تعبیرات موجود ہیں خصوصاً ''توحید'' کے متعلقہ ''برہان نظم'' کی ابحاث میں اس کائنات کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور ایسے ایسے انکشافات کیئے گئے ہیں کہ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی سائنسدان ان اسرار کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے۔

اس قسم کے انکشافات کے مجموعہ کو ہم ''قرآن کے علمی معجزات'' کا نام دے سکتے ہیں، یہاں پر ہم چند علمی معجزات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

قرآن اور قوت جاذبہ کا قانون

مشہور سائنس دان ''نیوٹن'' سے پہلے کسی نے بھی کشش ثقل کے قانون کو مکمل طور پر دریافت نہیں کیا تھا، کہتے ہیں کہ ایک دن نیوٹن سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرگیا اس معمولی اور عام سے واقعہ نے اسے فکر کی نئی راہوں سے آشنا کیا اور وہ کئی سال سوچتا رہا کہ یہ کونسی طاقت تھی جس نے سیب کو اپنی طرف کھینچ لیا؟ سیب درخت سے ٹوٹ کر آسمان کی طرف کیوں نہیں گیا؟ اور پھر سالہا سال کی سوچ وبچار کے نتیجہ میں اس نے قانون جاذبہ یا کشش ثقل کا انکشاف کیا جس سے ثابت ہوا کہ دو جسم ایک دوسرے کو مخصوص فاصلہ رکھتے ہوئے کھینچتے ہیں، اس قانون کے انکشاف کی روشنی میں منظم نظام شمسی کو ثابت کیا گیا کہ: بہت بڑے بڑے کرات اپنے اپنے مدار میں سورج کے گرد کیوں گھومتے ہیں؟ وہ مدار سے نکل ایک دوسرے سے ٹکراتے کیوں نہیں؟ یا ایک دوسرے پر گر کیوں نہیں جاتے؟ وہ کونسی قدرت ہے کہ جس نے اس لامتناہی فضاء میں ایک دقیق دائرے کے اندر ان کرات کو گردش کی حالت میں زندہ رکھا ہوا ہے اور وہ سوئی کی نوک کے برابر بھی اسکی خلاف ورزی نہیں کرتے؟!

جی ہاں ''نیوٹن'' نے اس راز کو کشف کیا کہ:

اس دائرہ کی حرکت میں تیزی سے گھومنے والا جسم ایک طرف مرکز سے دور ہوتا ہے اور اسی وقت وہ مرکز کی طرف کھنچا بھی جا رہا ہے یہ قانون

حالت میں رکھا ہوا کہ وہ اپنے مدار میں رہنے پر مجبور ہے۔

لیکن ان تمام حقائق کو قرآن مجید سورہ رعد کی دوسری آیت میں چودہ سو سال قبل بیان کر چکا ہے ارشاد خداوند ہے:

"اللہ الذی رفع السمٰوات بغیر عمد ترونہا ثم استوی علی العرش و سخّر الشمس و القمر کلٌّ یجری لاجلٍ مُسمّی یدبّر الامر یفصّل الآیات لعلکم بلقاء ربکم توقنون" (سورہ رعد آیت ۲)

اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں (آسمانی کرات) کو تمھیں نظر آنے والے ستونوں کے بغیر (یعنی غیر مرئی ستونوں کیساتھ) بلند کیا پھر اس نے عرش پر سلطنت استوار کی اور سورج اور چاند کو مسخر کیا، ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت کے لیے چل رہا ہے وہی امور کی تدبیر کرتا ہے وہی نشانیوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے شاید تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے منقول ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

"الیس اللہ یقول بغیر عمد ترونہا ؟ قلت : بلیٰ ، قال: ثم عمد لکن لا ترونہا!"

کیا خدا نہیں فرماتا کہ تمھیں نظر آنے والے ستونوں کے بغیر (ہم نے اسے بلند کیا)؟ راوی کہتا ہے کہ امام کے استفسار کے جواب میں میں نے کہا، جی ہاں، امامؑ نے فرمایا لھذا ستون موجود ہیں مگر تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

کیا "قوت جاذبہ" کی وضاحت کرنے کیلئے عربی زبان میں عمد لا ترونھا" (اردو میں

غیر مرئی ستون) سے بہتر، واضح اور سادہ تعبیر وجود رکھتی ہے؟!

ایک اور حدیث میں حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں!

"ھذا النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوطۃ کل مدینۃ الی عمود من نور"

آسمان پر موجود یہ ستارے زمین پر موجود شہروں کی طرح (بڑے بڑے) شہر ہیں، اور ہر شہر دوسرے شہر کیساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کیساتھ) نور کے ستونوں کے ذریعے جڑا ہوا ہے!

اس جدید دور میں سائنسدان اور ماہرین فلکیات تسلیم کرتے ہیں کہ "آسمان پر موجود ستاروں میں سے کروڑوں ستارے ایسے ہیں کہ جن پر زندگی اور عقل رکھنے والے اجسام موجود ہیں" اگر چہ یہ ستارے ابھی تک انسان کی دسترس میں نہیں ہیں۔

زمین کی اپنے گرد اور سورج کے گرد گردش

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے زمین کی اپنے گرد (اور اپنے مدار میں) حرکت کا انکشاف کیا وہ اٹلی (Italy) کا رہنے والا ماہر فلکیات گالیلو تھا، یہ انکشاف اس نے آج سے تقریباً چار سو سال قبل کیا، اس انکشاف سے قبل تمام ماہرین وعلماء ارضیات و فلکیات مصری دانش مند "بطلیموس" کے نظریہ "ہیئت" پر عمل پیرا تھے، کہ اسکا خیال تھا: کائنات کا مرکز زمین ہے اور تمام سیارے (کرات) اسکے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

البتہ گالیلو کے اس علمی انکشاف پر کلیسا کے طرف داروں نے اس پر کفر کا فتویٰ جاری کردیا اور وہ اس بات پر مجبور ہوا کہ اپنے اس علمی انکشاف پر معذرت اور اظہار ندامت کر کے موت سے نجات حاصل کرے لیکن اسکے بعد والے علماء نے اسی کے نظریات کی روشنی میں کام کیا اور آج اس علمی انکشاف کو نہ صرف تمام ماہرین صحیح تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ نظریہ سائنسی تجربات سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ زمین اپنے مدار کے گرد حرکت کرتی ہے اور فضاؤں میں پرواز کے ذریعے انسان اپنی آنکھوں سے اس چیز کا نظارہ کر رہا ہے۔

مختصر یہ کہ زمین کی مرکزیت کا نظریہ غلط ثابت ہوا اور معلوم ہوا کہ یہ صرف ہماری حسی خطا تھی کہ زمین ساکن ہے اور تمام ستارے وسیارے اسکے گرد گردش کر رہے ہیں حالانکہ ہم خود حرکت میں تھے اور ستاروں کو حرکت میں فرض کر رہے تھے۔

بطلیموس کا نظریہ تقریباً پندرہ سو سال تک علماء کے اذہان پر چھایا رہا حتیٰ کہ قرآن مجید کے نزول کے بعد بھی کوئی اس نظریے کی مخالفت کی جرات نہ کر سکا۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سورہ نمل کی آیت ۸۸ میں واضح طور پر زمین کی حرکت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہو رہا ہے۔

"و تری الجبال تحسبها جامدة و هی تمر مرّ السحاب صنع الله الذی اتقن کل شیء انه خبیر بما تفعلون"

اور آپ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ایک جگہ ساکن ہیں جب کہ (اس وقت) یہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے یہ سب اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو پختگی سے بنایا ہے وہ تمہارے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے۔

اس آیت میں پہاڑوں کی حرکت کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے حالانکہ ہم انکو ساکن سمجھتے ہیں اور پہاڑوں کی حرکت کو بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دے کر بتایا جا رہا ہے کہ پہاڑ، بادلوں کی طرح تیزی و نرمی، آرام اور بغیر کسی شور و غوغا کے حرکت کرتے ہیں۔

"زمین کی حرکت" کو پہاڑوں کی حرکت سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی عظمت کو آشکار کیا جا رہا ہے، کیونکہ پہاڑ حالت حرکت میں نہیں ہیں بلکہ در اصل انکی حرکت "زمین کی حرکت" ہے (یا اپنے گرد زمین کا گھومنا یا پھر سورج کے گرد اس کرہ کی حرکت یا ہر دو مراد ہیں) آپ تصور کیجئے: کہ ایک ایسے دور میں "جب تمام علمی محافل اور دانشور حضرات اس بات پر مصرّ تھے کہ زمین ساکن و ثابت ہے اور سورج و ستارے حرکت میں ہیں" قرآن مجید کا اسکے برعکس یہ واضح اعلان کیا ایک عظیم علمی معجزہ شمار نہیں کیا جائے گا؟!

اور یہ اعلان بھی ایک ایسے شخص سے کہ جس نے نہ صرف کہیں سے کوئی سبق نہیں پڑھا بلکہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہا تھا کہ جو معاشرہ علم و تہذیب سے دور شمار ہوتا تھا، کیا یہ انکشاف اس آسمانی کتاب کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے؟!

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) ''قرآن کے علمی معجزات'' سے ہماری کیا مراد ہے؟

۲) سب سے پہلے قانون جاذبہ کا اظہار وانکشاف ''کس نے'' اور کس زمانہ میں کیا؟

۳) قرآن اس قانون جاذبہ کی خبر کس آیت میں دے رہا ہے؟ (آیت بتائیں) اور قرآن کی تعبیر بھی بتائیں۔

۴) ''زمین کے سکون کا نظریہ'' کس نے دیا؟ اور یہ کتنے سال انسانی افکار پر چھایا رہا؟

۵) قرآن مجید کس آیت اور کونسی تعبیر کے ذریعے ''زمین کی حرکت'' کی خبر دے رہا ہے؟

نواں سبق

پیغمبر اسلام کی سچائی وحقانیت پر ایک اور دلیل

ایک مدعی نبوت اور اسکی دعوت کی سچائی وحقانیت یا کذب وبطلان کا سراغ ''مطالبہ معجزہ'' کے علاوہ دیگر طریقوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے اور یہ طریقے دعوی کی حقیقت تک پہنچنے کیلئے ایک مزید واضح دلیل شمار ہونگے، اور وہ طریقے درج ذیل آثار وقرائن کی دقیق جمع آوری سے حاصل ہوسکتے ہیں:

۱) اخلاقی خصوصیات اور معاشرتی خدمات۔

۲) دعوت کے زمانے میں معاشرہ کی وضعیت۔

۳) زمان کی شرائط۔

۴) دعوت میں شامل مختلف امور۔

۵) داعی کا لائحہ عمل یا پروگرام اور اس ہدف تک پہنچنے کے وسائل۔

۶) ماحول پر دعوت کے اثرات کا اندازہ۔

۷) داعی کا اپنے ہدف سے متعلق جذبہ ایمان وفداکاری۔

۸) دشمن کی دھمکیوں اور لالچ کی پرواہ نہ کرنا۔

۹) عمومی افکار پر تیزی سے اثر انداز ہونا۔

۱۰) ایمان لانے والے لوگوں سے متعلق بحث اور یہ کہ وہ کس قسم کے طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔

اگر ہم مندرجہ بالا دس مسائل ہر مدعی (نبوت) کے حوالے سے مورد بحث قرار دیں تو ہم نہ صرف حقانیت کا ایک معیار قائم کر سکتے ہیں بلکہ آسانی کیساتھ اسکی سچائی یا جھوٹ کا بھی علم حاصل کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا دس مسائل میں ہم حضرت پیغمبر اسلامؐ کے حوالے سے ایک دقیق بحث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر چہ ان کے بارے میں مفصل بحث کرنے سے چند کتابیں دائرہ تحریر میں آسکتی ہیں:

۱) مختلف مکاتب و مذاہب سے تعلق رکھنے والے مورخین نے حضرت پیغمبر اسلام کی اخلاقی خصوصیات سے متعلق جو باتیں تحریر کی ہیں ان میں یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ آپؐ اسقدر پاک و پاکیزہ اور کار خیر کرنے والے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں ہی آپ کو "امین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا، تاریخ کہتی ہے کہ: جب آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو حضرت علیؑ کو اس بات پر مامور کیا کہ آپؐ کے بعد وہ آپؐ کے پاس موجود لوگوں کی امانتیں انکو لوٹا دیں۔

آپؐ کی شجاعت، استقامت، حسن اخلاق، وسعت قلبی، جوانمردی اور درگزر جیسی خصوصیات کا مشاہدہ "حالت جنگ و صلح" ہر جگہ کیا جا سکتا ہے "خصوصاً فتح مکہ کے موقعہ پر جب آپ نے اپنے خونخوار دشمن کیلئے عام معافی کا اعلان فرمایا" معافی کا اعلان آپ کی ان خصوصیات کی ایک زندہ مثال ہے۔

۲) تمام افراد جانتے ہیں کہ ایک عام و معمولی انسان (حتی کہ ان میں سے باکمال

لوگ بھی) کسی نہ کسی طرح گردش ایام میں کم و زیاد معاشرے کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اب سوچیے کہ جو شخص چالیس سال تک جاہل و بت پرست معاشرے میں زندگی گزارے ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں ہر شخص کے رگ و پے میں شرک و خرافات کی بھرمار ہو، اسکے لیئے کیسے ممکن ہے کہ وہ فقط توحید کے ساتھ ملحق رہے اور تمام مظاہر شرک سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے؟

کیسے ممکن ہے کہ جہالت کے محور میں رہتے ہوئے علم کے اعلی ترین درجات سے کائنات کو منور کرے؟

آیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ "ماوراء طبیعت" سے تایید الہی کے بغیر یہ عجیب شاہکار ظہور میں آسکے؟

۳) ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آپؐ کا ظہور کس زمانے میں ہوا؟ وہ ایک ایسا زمانہ تھا جب دنیا قرون وسطی کی وادی سے گزرتی ہوئے مطلق العنانیت اور آمریت، ناجائز تعصبات اور ظالمانہ نسلی و طبقاتی امتیازات کا شکار تھی، اس بات کو ہم حضرت علیؑ "جو کہ قبل از ظہور اسلام اور بعد از ظہور اسلام کے عینی گواہ ہیں" کی زبان مبارک سے نقل کرتے ہیں:

آپ فرماتے ہیں: خدا نے آپ کو ایک ایسے زمانے میں رسالت پر مبعوث فرمایا جب لوگ حیرت و تعجب کی وادیوں میں گمراہ و پریشان تھے، ان کی عقل انکی خون آشام ہوا و ہوس کے تابع تھی، غرور و تکبر نے انہیں زوال پزیر کر دیا تھا، جہالت کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہے تھے، اور غیض و غضب و اضطراب کی حالت نے انہیں مضطرب و پریشان کر رکھا تھا (نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱)۔

اب تصور کیجئے ایک ایسا آئین جسکا نعرہ "لوگوں کے درمیان مساوات" و تمام نسلی

طبقاتی فرق کو ختم کرنا" اور " انما المؤمنون اخوۃ"، "تمام مومن (آپس میں) بھائی ہیں" پر مشتمل ہو، اس زمانے کے حالات سے کیا مطابقت رکھتا ہے؟

۴) آپ کی دعوت، تمام ابعاد میں توحید و وحدانیت، تمام ظالمانہ و جابرانہ امتیازات کا خاتمہ، دنیا کے تمام انسانوں کے درمیان اتفاق و اتحاد، ظلم و ستم کے مقابلہ میں جہاد، ایک عالمگیر عادلانہ حکومت کی بنیاد مظلوم اقوام کا دفاع، تقوی، پاکیزگی اور امانت داری کو انسان کی قدر و قیمت کا معیار قرار دینا، جیسے اہم ترین موضوعات پر مشتمل تھی۔

۵) اپنے الہی پروگرام کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے کسی بھی صورت میں غیر منطقی راستوں سے فائدہ نہ اٹھایا اور نہ ہی کسی کو اس بات کی اجازت دی، اور ہمیشہ اپنے مقدس اہداف کے حصول کیلئے مقدس وسائل کا انتخاب کیا، قرآن صریحاً اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

"ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا ......"

(المائدۃ آیت ۸)

اور کسی قوم کی دشمنی تمہاری بے انصافی کا سبب نہ بنے الخ

جنگ کے میدانوں میں اخلاقی اصولوں کی رعایت، غیر فوجی (عام) انسانوں کو اذیت و تکلیف نہ دینا، باغات و درختوں کو پامال نہ کرنا، دشمن کے پینے کے پانی کو آلودہ نہ کرنا، جنگی قیدیوں سے محبت و رعایت کا سلوک اور ان جیسے دسیوں احکامات اس واقعیت کو روشن کرنے کیلئے تاریخ کے اوراق پر موجود ہیں۔

۶۔ آپ کی دعوت توحید اس قدر پر تاثیر تھی کہ دشمنان اسلام ہمیشہ لوگوں کے آپکے قریب آنے سے خوفزدہ رہتے تھے کیونکہ آپ میں قوت جاذبہ اور کلام میں نفوذ کا اثر بدرجہ

اتم موجود تھا، بعض اوقات آپکی گفتگو کے دوران دشمنان اسلام شور و غل کرتے تھے تاکہ لوگ آپ کے کلام مبارک کو سن کر آپ کے گرویدہ اور اسلام کے پیروکار نہ بن جائیں یہی وجہ تھی کہ دشمنان نے آپ کے کلام کی تاثیر سے خوفزدہ ہو کر آپکو "ساحر" اور آپکے کلام کو سحر کہنا شروع کر دیا تھا یہ بات آپ کی دعوت کے پر تاثیر ہونے اور قلوب پر چھا جانے کا اعتراف تھی۔

۷۔ اپنی دعوت سے آپ کا لگاؤ اور اس الہی آئین نامہ سے آپکا عشق و فداکاری اور اس کا پابند ہونا بھی آپکی حقانیت کی دلیل ہے۔

بعض جنگوں کے میدانوں سے جب تازہ اسلام لانے والے لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے تو آپ انتہائی سختی سے دشمن کے مقابلہ پر ڈٹے رہے، اور دشمن کے لالچ دینے یا دھمکانے، غرض ہر قسم کے انداز و اطوار کے مقابلہ میں ثابت قدم رہے اور کوئی بھی بات یا مسئلہ آپ کے پاؤں میں لغزش پیدا نہ کر سکا۔

۸۔ کفار نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ آپ کو اپنی انحرافی سازشوں کے جال میں پھانس لیں مگر آپ کبھی بھی اس جال میں نہ آئے آپؐ نے فرمایا اگر سورج کو میرے ایک ہاتھ پر اور چاند کو دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا جائے (تمام نظام شمسی کو میرے زیر تسلط قرار دے دیا جائے) تو تب بھی میں اپنے ہدف سے ہرگز دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

۹۔ عام انسانوں کیلئے آپ کی دعوت نہ صرف پر اثر تھی بلکہ انتہائی تیزی و ناقابل بیان سرعت کیساتھ انکے افکار میں تبدیلی کا باعث بھی بنی، جن افراد نے اسلام کے بارے تحقیق کرنے والے مغربی لوگوں کی اسلام سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ مغربی محققین "اسلام کی پیدائش اور پھر تیزی کیساتھ اس کے پھیلاؤ" [illegible]

حیران ہیں۔

مثلاً مغرب کے تین مشہور اساتذہ کہ جنہوں نے "تاریخ تمدن عرب اور مشرق میں اسکی بنیادیں" نامی کتاب تحریر کی ہے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اس بات کو جاننے کیلئے کہ اسلام نے اس قدر تیزی سے کیسے ترقی کی؟ اور ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ترقی پذیر دنیا کے تمام اہم علاقوں پر چھا گیا، اب تک کی گئی تمام کوششوں کے بعد بھی یہ راز اور معما حل نہیں ہوسکا۔

جی ہاں یہ واقعاً ایک معما ہی ہے کہ اس زمانے کے ناگفتہ بہ وسائل کے باوجود اس قدر تیزی کیساتھ اسلام کروڑوں لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں کیسے اتر گیا؟ بہت سی تہذیبوں اور ثقافتوں کو ختم کرکے ایک نئی تہذیب اور ثقافت کو کیسے وجود میں لے آیا؟

۱۰) آپ کے دشمن کفر و استکبار کے سردار، ظالم، ثروتمند اور خود پسند تھے جبکہ آپکی دعوت پر ایمان لانے والوں کی اکثریت پاکدل نوجوان تھے اور ایک بہت بڑا گروہ جو محروم و مظلوم طبقات پر مشتمل تھا حتی کہ غلام بھی تھے یعنی وہ افراد کہ جنکا تمام سرمایہ فقط سچائی و پاکدلی تھی اور وہ حق کے متلاشی اور پیاسے تھے۔

اس تمام بحث کے بعد کہ جسکی شرح بہت تفصیلی ہے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ: آپ کی دعوت ایک الٰہی دعوت تھی ایک ایسی دعوت جو لوگوں کی طبائع اور نفوس میں اتر گئی، ایک ایسی دعوت جو پروردگار کی طرف سے لوگوں کو فساد و تباہی، جہالت، شرک اور ظلم و ستم سے نجات دلانے کیلئے بھیجی گئی تھی۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) کیا پیغمبر اسلام کی حقانیت کی پہچان کیلئے معجزہ کے علاوہ بھی کوئی دلیل ہے؟ اگر ہے تو بیان کریں؟

۲) "قرائن کی جمع آوری" سے کیا مراد ہے؟ اور کن امور سے متعلق زیادہ فکر کرنے کی ضرورت ہے؟

۳) قبل از اسلام اور بعد از ظہور اسلام کے عرب معاشرے کے باہمی مقایسہ و تقابل سے ہمیں کن باتوں کا علم ہوسکتا ہے؟

۴) زمانہ جاہلیت میں عرب معاشرے کی حالت کیا تھی؟ توضیح دیں۔ دیگر دنیا کے حالات بھی مختصراً بیان کریں۔

۵) ۔ دشمنان اسلام حضرت پیغمبر اسلام کو جادوگر کیوں کہتے تھے؟

دسواں سبق

حضرت پیغمبر اسلامؐ کا آخری نبی ہونا

خاتمیت کا دقیق مفہوم:

پیغمبر اسلامؐ خدا کے آخری پیغمبر ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہوگیا ہے، یہ بات ''ضروریات دین مبین اسلام'' میں سے ہے۔

''ضروری یا ضروریات'' کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی مسلمانوں کی صف میں داخل ہوتا ہے بہت جلد جان لیتا ہے کہ تمام مسلمان اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ چیز مسلمانوں کے نزدیک واضح اور تسلیم شدہ ہے۔ یعنی جو شخص بھی کسی مسلمان سے کوئی تعلق قائم کرے اسے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ جس طرح مسلمان خدا کی ''توحید'' کے قائل ہیں اسی طرح پیغمبر اسلام کے ''آخری نبی'' ہونے پر بھی سب کا اتفاق ہے اور کوئی بھی مسلمان کسی اور نبی کے انتظار میں نہیں ہے۔

درحقیقت بعثت انبیاء سے قافلہ بشریت نے تکامل کے مختلف مراحل یکے بعد دیگرے طے کیے ہیں اور بالآخر انسان رشد و تکامل کی اس منزل تک پہنچ گیا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے یعنی ''اسلام کی مکمل اور جامع تعلیمات کی روشنی میں اپنے مسائل اور مشکلات کو

حل کرسکتا ہے''۔

بالفاظ دیگر: اسلام آخری اور جامع ترین قانون کا نام ہے کہ جسکے ذریعے بشر اپنے مسائل حل کرسکتا ہے اعتقادات کے حوالے سے دینی بصیرت کا مسئلہ ہو یا عمل کے اعتبار سے نظم وضبط، اسلام انسان کی تمام ضروریات کو ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر حل کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام کے خاتم الانبیاء ہونے کی دلیل

اس دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے ہمارے پاس متعدد دلائل ہیں جن میں سے زیادہ روشن درج ذیل تین دلیلیں ہیں:

۱) اس مسئلہ کا ''ضروری'' ہونا کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں کہ کوئی بھی شخص دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود کسی مسلمان سے رابطہ کرے تو وہ اسے ''پیغمبر اسلام کی خاتمیت'' کا معتقد پائے گا، لھذا اگر کوئی شخص ''اسلام'' کو ''دلیل اور منطق'' کے ذریعے بطور مذہب اختیار کرے تو اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ''خاتمیت'' کے عقیدہ کو بھی اختیار کرے، کیونکہ ہم گذشتہ اسباق میں اسلام کی حقانیت اور اسکے قوانین کو متعدد دلیلوں سے ثابت کر چکے ہیں اور چونکہ ''خاتمیت کا عقیدہ'' بھی ضروریات دین میں سے ہے لھذا اسکو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

۲) آیات قرآن بھی آپؐ کے آخری نبی ہونے پر گواہ ہیں جیسے مثلاً:

"ما كان محمد ابا احد من رجالكم و لكن رسول الله و خاتم النبيين" (احزاب آیت ۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم

النبیین ہیں الخ

یہ تعبیر قرآن مجید نے اس وقت پیش کی جب عربوں میں ''لے پالک بچوں'' کا رواج عام تھا۔ وہ کسی کے بچے کو لیکر اپنا فرزند قرار دے دیتے تھے اور حقیقی اولاد کی طرح اپنے خاندان میں شامل کر لیتے تھے وہ ''محرم'' ہوتا اور ''میراث'' کا بھی حقدار قرار دیا جاتا تھا۔

لیکن اسلام نے آکر اس جاہلانہ رسم کا خاتمہ کیا اور کہا! ''لے پالک بچے حقیقی بچوں کی طرح شرعی وحقوقی قوانین میں شریک نہیں ہو سکتے'' ان میں سے ایک ''حضرت زید'' بھی تھے جنکی پرورش آپؐ نے فرمائی تھی لیکن وہ آپؐ کے حقیقی فرزند شمار نہیں ہو سکتے تھے۔ لھذا قرآن مجید نے کہا: بجائے اسکے کہ تم پیغمبر اسلام کو ان لوگوں میں سے کسی کا باپ کہہ کر پکارو انؐ کے دو حقیقی اوصاف ''رسالت'' اور ''خاتمیت'' (یعنی رسول اللہ یا خاتم النبی) سے پکارا کرو۔

ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا آپ کی رسالت کی طرح واضح طور پر روشن اور ثابت تھا۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ ''خاتم'' کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

''خاتم'' کی اصل ''ختم'' ہے جسکا معنی ''ختم کرنیوالا اور وہ چیز کہ جسکے ذریعے کسی کام کو ختم کیا جائے'' ہے مثلاً خط کے آخر میں لگائی جانے والی مہر کو بھی ''خاتم'' کہتے ہیں۔ اور انگوٹھی کے نگینے کو ''خاتم'' کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس زمانہ (جاہلیت) میں ''نام والی مہر'' کی بجائے نگینے سے ہی کام لیا جاتا تھا ہر ایک کی انگوٹھی کے نگینہ پر مختلف اور مخصوص نقش و نگار یا نام کندہ ہوتا تھا اور وہ اسے اپنے خط یا مکتوب کے آخر میں لگا دیتا تھا۔

اسلامی روایات میں ہے کہ جب آپؐ نے اس زمانے کے مختلف بادشاہوں،

سرداروں اور رئیسوں کے نام اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے کیلئے خطوط لکھنے کا فیصلہ فرمایا تو آپکی خدمت میں عرض کیا گیا کہ: ''غیر عرب بادشاہ مہر کے بغیر کسی بھی خط کو قبول نہیں کرتے'' جبکہ اس وقت تک پیغمبر اسلامؐ کے تمام خطوط مکمل طور پر سادہ اور بغیر مہر کے ہوتے تھے لھذا آپؐ کے حکم سے ایک انگوٹھی تیار کی گئی اور اسکے نگینے پر " لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ " کا جملہ نقش کیا گیا اور پھر آپؐ کے تمام خطوط پر یہی مہر لگائی جاتی تھی۔

لہٰذا ''خاتم'' کا اصلی معنی ''ختم کرنے والا'' اور ''آخر تک پہنچانے والا'' ہے۔

۳) بہت سی روایات واضح طور آپ (ص) کے ''آخری نبی'' ہونے کو ثابت کرتی ہیں ان میں سے کچھ روایات ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

الف: تفسیر مجمع البیان میں ایک معتبر حدیث حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے اور آپ نے یہ حدیث حضرت پیغمبر اکرمؐ سے ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''انبیاء کے درمیان میری مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی شخص نے ایک خوبصورت محل تعمیر کیا ہو مگر صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو جسکے نتیجہ میں جو شخص بھی اس محل کو دیکھتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیا خوبصورت محل ہے لیکن ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے، میں وہی آخری اینٹ ہوں اور تمام انبیاء کی نبوت کا سلسلہ میرے اوپر ختم ہو گیا ہے''

حضرت امام صادق فرماتے ہیں:

"حلال محمد حلال ابداً الی یوم القیامۃ و
حرامہ حرام ابداً الی یوم القیامۃ"

حلال محمدؐ قیامت تک حلال اور حرام محمدؐ قیامت تک حرام ہے۔

(اصول کافی ج/۱ص ۵۸)

اہل تشیع اور تسنن کے ہاں پیغمبر اکرمؐ کی مشہور و معروف حدیث میں آپؐ حضرت علیؑ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " انت منی بمنزلة هارون من موسی الا انه لا نبی بعدی" آپؐ کی میرے ساتھ وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون کی حضرت موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد سلسلہ نبوت ختم ہوگیا ہے۔

اسکے مشابہ بھی دسیوں احادیث اس بات کو ثابت کرتی ہیں۔

نبی اکرمؐ کے آخری نبی ہونے کے بارے میں کچھ سوالات ایسے ہیں کہ جنکی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

۱) بعض افراد کہتے ہیں اگر (لوگوں کی ہدایت کیلئے) انبیاء کا بھیجا جانا خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا فیض و کرم ہے تو موجودہ زمانے کے لوگ اس بہت بڑے فائدے سے محروم کیوں ہیں؟ اس زمانے کے لوگوں کی رہبری اور ہدایت کیلئے کسی نئے رہنما کو کیوں نہیں بھیجا جاتا؟

اسی قسم کی باتیں کرنے والے لوگ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ! ہمارے زمانے میں کسی نبی کے نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس زمانے کے لوگ وہ لیاقت اور خوبی نہیں رکھتے کہ جسکی وجہ سے انکے لیے نبی بھیجا جائے، بلکہ اس زمانے میں فکری و علمی طور پر کاروان انسانیت اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ اگر اسکے پاس پیغمبر اسلام کی صحیح تعلیمات ہوں اور وہ ان پر عمل بھی کرے تو وہ صراط مستقیم پر قائم و دائم رہ سکتا ہے۔

ہم زیادہ وضاحت کیلئے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

اولوالعزم انبیاء (یعنی وہ نبی جو صاحب کتاب اور نئی شریعت کیساتھ مبعوث ہوئے) پانچ ہیں (حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت پیغمبر اسلامؐ علیہم التحیۃ والسلام) ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص زمانے میں لوگوں کی ہدایت اور انکے رشد و کمال کیلئے تکالیف برداشت کیں جسکے نتیجہ میں قافلہ بشریت ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا رہا اور دوسرے اولوالعزم پیغمبر نے اس قافلے کو تیسرے کے حوالے اور پھر آخر میں یہ قافلہ اپنی آخری منزل تک پہنچ کر اس قابل ہوگیا کہ اپنے راستے پر قائم و دائم رہ سکے، یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک طالب علم اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کیلئے مختلف تعلیمی مراحل طے کرتا ہے تاکہ تعلیم سے فارغ ہوسکے (البتہ فارغ التحصیل ہونا کوئی قابلیت کا معیار نہیں ہے بلکہ ایک کامیاب اور مستقل زندگی اصل معیار ہے) پہلے پرائمری پھر مڈل، ہائی، ایف اے، ایم اے اور آخر میں پی، ایچ، ڈی ''Doctor of philosophy'' یا M.B.B.S۔

اگر ایک ڈاکٹر اسکول یا یونیورسٹی میں نہیں جاتا تو اسکا یہ مطلب نہیں ہے وہ یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا، بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکے پاس اتنی علمی معلومات ہیں کہ اپنی علمی مشکلات کو حل کرسکتا ہے یا مزید مطالعہ کرکے ترقی کی منازل عبور کرسکتا ہے۔

۲) ''دوسرا اعتراض'' چونکہ معاشرہ ہمیشہ تغیر و تبدل کا شکار ہے لھذا اسلام کے مستقل اور یکساں قوانین معاشرے کے جدید مسائل اور ضروریات کا حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

جواب: اسلامی قوانین دو قسم کے ہیں پہلی قسم ان قوانین پر مشتمل ہے جو انسانی خصوصیات کی طرح ثابت اور برقرار ہیں جیسے ''توحید''

کے قوانین کا اجرا'' ہر قسم کے ظلم وستم اور نا انصافی کے خلاف آواز حق کو بلند کرنا وغیرہ۔

دوسری قسم ان جامع قوانین اور اصولوں پر مبنی ہے جو مختلف موضوعات کے تغیر و تبدل کیساتھ نئی صورت کو قبول کرتے ہیں اور جدید زمانے کی مشکلات اور مسائل کا حل پیش کرتے ہیں مثلا ہمارے پاس ایک ''اسلامی قاعدہ'' بعنوان " اوفوا بالعقود " (اپنے عہد و پیمان کا احترام کرتے ہوئے انہیں پورا کرو) موجود ہے۔

ہمیں زمانے کے گزرنے کیساتھ ساتھ مختلف ''تجارتی، سیاسی اور اجتماعی'' مفید قرار دادیں (Resolution) پیش آتی ہیں ہم مندرجہ بالا'' قانون کلی'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ان جدید مسائل کا جواب دے سکتے ہیں۔

اسی طرح دوسرا قاعدہ بنام'' قاعدہ لاضرر ولا ضرار'' ہر اس قانون اور حکم کے مقابلہ میں ہمارا مددگار ہے جو قانون ''کسی فرد یا معاشرہ'' کیلئے باعث ضرر ونقصان ہو۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اسلام کے کلی قوانین کس قدر ہمارے مسائل اور مشکلات کو حل کرتے ہیں، اور اس قسم کے قوانین ''اسلام'' میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور انہیں قوانین کی مدد سے ہم نے عظیم اسلامی انقلاب کے بعد اپنی پیچیدہ قسم کی مشکلات پر قابو پایا ہے اور انہیں حل کر رہے ہیں۔

۳) تیسرا اعتراض: بلاشک وتردید ہم اسلامی مسائل کے سلسلہ میں'' رہبر و قائد'' کے محتاج ہیں جبکہ سلسلہ نبوت کے ختم اور انکے جانشین کے پردہ غیبت میں ہونے کیوجہ سے ہم رہبر سے محروم ہوگئے ہیں (جبکہ کسی اور نبی کا انتظار بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے) کیا یہ بات اسلامی معاشرے کیلئے شدید نقصان دہ نہیں ہے۔

جواب: اس دور میں ایسے فقیہ کو رہبر قرار دیا گیا ہے جو تمام ضروری شرائط کا حامل، علم و

تقوی اور سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں ماہر اور صاحب نظر ہو۔

اس قسم کے رہبر کی پہچان کیلئے بھی'' اسلام'' نے ہماری راہنمائی کی ہے لھذا یہ مسئلہ بھی پریشان کن نہیں ہے۔

دراصل'' ولایت فقیہ'' سلسلہ انبیاء و اوصیاء کا ہی حصہ ہے'' جامع الشرائط فقیہ کی رہبری'' اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرے سرپرست و راہنما کے بغیر آزاد نہیں چھوڑے گئے (۱)

---

۱) مزید وضاحت کیلئے حضرت آیت اللہ مدظلہ کی کتاب ''طرح حکو[illegible]

سوچیے اور جواب دیجیے:

۱) ''خاتمیت'' کا دقیق مفہوم کیا ہے؟

۲) ''آیات قرآن'' سے ''خاتمیت'' کو ثابت کریں؟

۳) ہمارے زمانے کے لوگوں کی طرف انبیاء الٰہی مبعوث کیوں نہیں کیئے جارہے؟ ہم اس اعزاز سے کیوں محروم ہیں؟

۴) اسلامی قوانین کتنی قسم کے ہیں؟ اور ہمارے زمانے کے مسائل کا حل کیسے پیش کرتے ہیں؟

۵) کیا ایک اسلامی معاشرہ رہبر کے بغیر قائم رہ سکتا ہے؟ ہمارے زمانے میں ''رہبری کے مسئلہ'' کا حل کیا ہے؟

امامت

پہلا سبق

امامت کی بحث کا آغاز کب ہوا؟

ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے:

ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ پیغمبرؐ نے اپنے لئے کوئی جانشین معین نہیں فرمایا بلکہ اس کام کو امت کے سپرد کر دیا ہے تا کہ امت کے افراد مل بیٹھ کر "اپنے درمیان میں سے ہی" کسی فرد کو اپنا رہبر بنا لیں اس گروہ کو "اہل سنت" کہا جاتا ہے۔

دوسرے گروہ کا عقیدہ تھا کہ پیغمبرؐ کے جانشین کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیغمبر کی طرح "گناہوں اور خطاؤں سے پاک و معصوم ہو نیز ایسے غیر معمولی اور بے پناہ علم کا حامل ہو کہ لوگوں کی روحانی اور مادی رہبری کے عہدہ پر فائز ہو سکے اور اسلام کے اصولوں کی حفاظت اور بقاء کا انتظام کر سکے۔

لھذا اس گروہ کا عقیدہ تھا کہ "ایسے شخص (جانشین) کا انتخاب صرف خدا کی طرف سے پیغمبر کے وسیلہ سے ممکن ہے" اور پیغمبر اسلام نے اس وظیفہ کو انجام دیتے ہوئے حضرت علیؑ کو اپنے جانشین کے طور پر منتخب کر دیا ہے۔

اس گروہ کو "امامیہ" یا "شیعہ" (اہل تشیع) کہا جاتا ہے۔

ہمارا ان مختصر سی ابحاث میں مقصد یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ (امامت) پر عقلی و تاریخی دلائل، قرآنی آیات اور سنت پیغمبر کی روشنی میں غور و فکر کریں۔

لیکن بحث کے آغاز میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ چند نکات کی طرف اشارہ کر دیں:

۱) کیا یہ بحث اختلافات بڑھانے والی ہے؟

بعض لوگ مسئلہ امامت پر بحث شروع ہوتے ہی فوراً بول اٹھتے ہیں کہ آج کل ان باتوں کا زمانہ نہیں ہے!

موجود زمانہ "اتحاد بین المسلمین" کا زمانہ ہے جبکہ جانشین پیغمبرؐ کے موضوع پر گفتگو تفرقہ بازی اور اختلافات کا باعث بنتی ہے!

آج ہمیں اپنے مشترکہ دشمنوں کا سامنا ہے ہمیں چاہیے کہ ان کے بارے سوچیں: صیہونزم (یہودیت کی عالمگیر تحریک) اور مشرق و مغرب کی سامراجی طاقتوں کا سامنا ہے لھذا ہمیں چاہیئے کہ ہم ان اختلافی مسائل کو پس پشت ڈال دیں، لیکن یہ انداز فکر صریحاً ایک غلطی ہے کیونکہ:

۱) وہ چیزیں جو اختلافات اور تفرقہ بازی کا باعث ہیں وہ تعصب سے بھری ہوئی غیر منطقی اور کینہ پرور ابحاث ہیں۔

لیکن محبت و دوستی کے ماحول میں منطقی، دلائل کے ساتھ اور تعصب و دشمنی سے پاک ابحاث نہ صرف اختلاف میں اضافے کا باعث نہیں بنتیں بلکہ باہمی فاصلوں کو کم اور مشترکہ نقطہ نظر کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

خود میں نے حج وزیارات کے متعدد مواقع پر حجاز کے اہل سنت کے علماء اور دانشوروں سے کئی بار بحث کی، میں اور وہ (علما اہل سنت) دونوں ہی اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ یہ ابحاث نہ صرف ہمارے تعلقات پر برا اثر نہیں ڈالتیں بلکہ آپس میں افہام وتفہیم اور مثبت سوچ وفکر کے بڑھانے کا باعث بنتی ہیں، آپس کے فاصلوں کو کم کرتی ہیں اور اگر کوئی بغض وعناد ہو تو اسے دلوں سے دھو ڈالتی ہیں۔

خاص طور پر ان ابحاث کے نتیجہ میں یہ واضح ہو جاتا تھا کہ ''ہمارے درمیان بہت سے مشترک نقطہ نظر موجود ہیں کہ جن پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے ہم اپنے مشترکہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اہل سنت چار مذاہب میں تقسیم ہوئے: ۱) حنفی ۲) حنبلی ۳) شافعی ۴) مالکی

ان چار مذاہب کا وجود اہل سنت میں تفرقہ کا باعث نہیں بنا لھذا اگر وہ (اہل سنت) فقہ شیعہ کو کم از کم ایک پانچویں فقہی مذہب کی حیثیت سے ہی قبول کرلیں تو بہت سی مشکلات اور اختلافات کا خاتمہ ہو سکتا ہے جیسا کہ ماضی قریب میں (تقریباً ۴۰ سال قبل) اہل سنت کے ایک بڑے مفتی اور مصر کی الازہر یونیورسٹی کے سربراہ (chancellor) ''شیخ شلتوت'' نے ایک بڑا مؤثر قدم اٹھایا اور اہل سنت کے درمیان فقہ شیعہ کا رسمی طور پر اعلان کیا اور اس طرح سے انہوں نے اتحاد اسلامی کیلئے زبردست خدمت انجام دی جسکی وجہ سے ان کے اور ملت تشیع کے مرجع اعلی آیت اللہ بروجردی مرحوم کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔

۲) ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کی تجلی ہر مذہب سے زیادہ مذہب تشیع میں دیکھی جا سکتی ہے اگر چہ ہم تمام اسلامی مذاہب کا احترام کرتے ہیں لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ مذہب تشیع

ہی حقیقی اسلام کے سارے پہلوؤں کا مکمل اور بہترین تعارف کرا سکتا ہے اور اسلامی حکومت سے متعلق تمام مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے۔

تو پھر کیوں نہ اس مکتب کی دلائل کے ساتھ اپنے بچوں کو تعلیم دیں؟! اور اگر ہم یہ کام انجام نہیں دیتے تو یقیناً ہم نے اپنے بچوں کیساتھ خیانت کی ہے۔

ہم پورے یقین کیساتھ کہتے ہیں کہ ''پیغمبر اسلامؐ نے اپنے جانشین کو معین فرمایا ہے'' کیا مشکل ہے کہ اگر عقل ومنطق اور دلائل سے اس موضوع پر بحث کو بڑھائیں؟

لیکن یہ گفتگو کرتے وقت ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے تاکہ دوسروں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔

۳) اسلام کے دشمنوں نے ''اتحاد بین المسلمین'' کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے لئے شیعوں کے خلاف اہل سنت سے اور سنیوں کے خلاف اہل تشیع سے اس قدر جھوٹ بولے اور الزام تراشیاں کی ہیں کہ چند ممالک میں یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر دور ہو گئے ہیں۔

جب ہم ''مسئلہ امامت'' کو اس انداز سے ''جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے'' پیش کریں اور ان نکات کو کہ جن پر اہل تشیع ایمان رکھتے ہیں قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل سے واضح کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تمام پروپیگنڈا غلط تھا اور ہمارے مشترک دشمنوں نے صرف زہر اگلا ہے۔

مثال کے طور پر میں یہ نہیں بھول سکتا کہ جب اپنے سعودی عرب کے ایک سفر کے دوران سعودی عرب کی ایک مذہبی شخصیت سے میری ملاقات اور بحث ہوئی تو انہوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ ''میں نے سنا ہے کہ جو قرآن اہل تشیع

موجود قرآن سے مختلف ہے''۔

مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا، میں نے ان سے کہا: بھائی اس بات کی تحقیق تو بہت آسان ہے!

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ خود یا آپ کا کوئی نمائندہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد ایران میں کوئی اطلاع دیئے بغیر میرے ہمراہ ایران چلے وہاں پر گلی کوچوں میں موجود مساجد میں بڑی تعداد میں قرآن موجود ہیں، اس کے علاوہ سب مسلمانوں کے گھروں میں بھی قرآن موجود ہیں ہم ہر اس مسجد میں جائیں گے جہاں آپ پسند فرمائیں گے یا پھر جس گھر پر پسند فرمائیں گے اسکا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور ان سے قرآن طلب کریں گے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ہمارے اور آپ کے قرآن میں ایک حرف یا ایک نقطہ تک کا اختلاف نہیں ہے (بہت سے قرآن جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں وہ سعودی عرب، مصر اور دیگر اسلامی ممالک کے ہی شایع شدہ ہیں)۔

آپ یقین کریں کہ اس محکم اور دوستانہ انداز سے گفتگو کی وجہ سے اسلام دشمنوں نے جو عجیب زہر افشانی اس مشہور شخص کے ذہن میں کر رکھی تھی اس کا اثر ختم ہوگیا۔

گویا امامت سے متعلق گفتگو اس انداز سے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے اسلامی معاشرے کی وحدت کو مستحکم کرتی ہے اور حقائق کو روشن کرنے اور آپس کے فاصلوں کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

۲) امامت کیا ہے؟

''امام'' جیسا کہ اس کے عنوان سے واضح ہے ''مسلمانوں کے پیشوا یا رہبر'' کے معنی

میں استعمال ہوتا ہے اور مذہب شیعہ کے اصول و عقائد کے اعتبار سے ''امام معصوم'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر طرح سے پیغمبرؐ کا جانشین ہو لیکن فرق صرف یہ ہے کہ پیغمبرؐ مکتب و مذہب کا بانی ہوتا ہے اور امام اس مکتب و مذہب کا محافظ و نگہبان ہوتا ہے، پیغمبرؐ پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن امام پر وحی نازل نہیں ہوتی، امامؑ پیغمبر سے تعلیمات حاصل کرتا ہے اور غیر معمولی علم کا حامل ہوتا ہے۔

اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق امام معصوم صرف اسلامی مملکت کا پیشوا ہی نہیں ہوتا بلکہ روحانی و مادی رہبری اور ظاہری و باطنی رہبری مختصر یہ کہ اسلامی معاشرہ کی ہر جہات سے قیادت پر فائز ہوتا ہے نیز اسلامی عقائد و احکام کی حفاظت کا بھی بغیر کسی خطاء اور انحراف کے ذمہ دار ہوتا ہے اور وہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے۔

لیکن اہل سنت امامت کی اس طرح تشریح نہیں کرتے، وہ امام کو صرف اسلامی معاشرے کا حاکم سمجھتے ہیں بالفاظ دیگر ہر دور اور زمانے کے حکمرانوں کو پیغمبرؐ کے خلفاء اور مسلمانوں کے رہبروں کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

البتہ آئندہ اسباق میں ہم یہ واضح کریں گے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں اللہ کے ایک نمائندے کا وجود ضروری ہے، یعنی پیغمبرؐ یا ایک امام معصوم زمین پر ہمیشہ ہو تاکہ وہ خدا کے قانون کی حفاظت اور طالبان حق کی رہبری و راہنمائی کرسکے، اور اگر کسی وجہ سے انسانوں کی نظر سے اوجھل ہوجائے تو اسکے نمائندے احکام الٰہی کی تبلیغ اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ زمانہ امامت کی بحث کرنے کیلئے غیر مناسب ہے انکی منطق (اور دلیل) کیا ہے؟

۲) انکی منطق (اور دلیل) کو رد کرنے اور اس موضوع (امامت) پر بحث کو ضروری قرار دینے کیلئے ہمارے پاس کتنے جواب ہیں؟

۳) اسلام کے دشمنوں نے مسلمانوں کے درمیان کس طریقے سے تفرقہ پھیلایا ہے اس تفرقہ کو ختم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

۴) کیا آپ دشمنوں کی تفرقہ اندازی کے کچھ نمونے پیش کر سکتے ہیں؟

۵) مذہب تشیع میں ''امامت'' سے کیا مراد ہے؟ اسکا مذہب اہل سنت میں ''امامت'' کے جو معنی ہے اس سے کیا فرق ہے؟

دوسرا سبق

امام کے وجود کا فلسفہ

انبیاء کی بعثت کی ضرورت کے بارے میں اس سے قبل جو گفتگو کی گئی ہے وہ بہت حد تک ہمیں نبیؐ کے بعد ''امام کے وجود کی ضرورت'' سے بھی آگاہ کرتی ہے کیونکہ بہت سے اہم موضوعات میں نبیؐ اور امامؑ مشترک ہیں لیکن اس جگہ پر یہ ضروری ہے کہ ہم بعض دوسری ابحاث پر بھی غور کریں:

۱) الٰہی رہبروں کی ہمراہی میں روحانی تکامل

سب سے پہلے ہمیں انسان کی خلقت کے مقصد کو سمجھنا چاہیے جو کہ گلدستہ کائنات کا سب سے اہم پھول ہے۔

وہ ''پروردگار'' کی طرف، ''کمال کی انتہا تک'' اور زندگی کے تمام ابعاد میں تمام روحانی مراحل طے کرنے کیلئے بہت لمبا اور نشیب و فراز سے پر راستہ طے کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اس راستے پر کسی معصوم پیشوا کی رہبری کے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اور ان مراحل میں کسی آسمانی استاد کی راہنمائی کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے اس لیے کہ: ''راستے میں تاریکیاں ہیں لھذا اگر اسی کے خطرات سے دوچار

یہ درست ہے کہ خدا نے انسان کو عقل وخرد کی نعمت سے نوازا ہے، اسے محکم اور بھر پور ضمیر عطا کیا ہے آسمانی کتابیں اسکے لیے بھیجی ہیں لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ یہ انسان ان تمام تکوینی اور تشریعی وسائل کے باوجود اپنی صحیح راہ کی شناخت میں غلطی کا شکار ہو جائے، لہٰذا بلا شک وشبہہ ایک معصوم پیشوا کا وجود اس کی راہ سے انحراف اور گمراہی کے خطرات کو بہت حد تک کم کر دیتا ہے۔ پس ''امام کا وجود انسان کے مقصد تخلیق کو کمال تک پہنچانے والا ہے''۔

یہی وہ چیز ہے جسے عقائد کی کتابوں میں ''قاعدہ لطف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قاعدۂ لطف: یعنی وہ تمام چیزیں جو انسان کی خلقت کے مقصد کے حصول کیلئے ضروری ہیں خداوند حکیم نے اس (انسان) کے اختیار میں دے دی ہیں، انبیاء کی بعثت اور امام معصوم کا وجود بھی ان ہی چیزوں میں سے ہے ورنہ (اگر انبیاء اور ائمہ معصومین کو لوگوں کی ہدایت کیلئے نہ بھیجے تو) خلقت انسان کی غرض کی مخالفت ہوگی (غور وفکر کیجئے)۔

۲) آسمانی ادیان کی حفاظت

ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ''الٰہی ادیان و مذاہب'' جب انبیاء کے قلوب پر نازل ہوتے ہیں تو بارش کے پانی کی بوندوں کی مانند صاف وشفاف، حیات بخش اور روح پرور ہوتے ہیں، لیکن جیسے جیسے وہ غلیظ ماحول اور کمزور یا ناپاک ذہنوں سے گزرتے ہیں تو آہستہ آہستہ آلودہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور خرافات اور توہمات کا ان میں اسقدر اضافہ کیا جاتا ہے کہ بنیادی پاکیزگی اور ظرافت ضائع ہو جاتی ہے، اس صورت میں نہ ان میں کوئی جاذبیت باقی رہتی ہے اور نہ ہی تربیت کی تاثیر، نہ ان سے پیاسوں کو سیراب کیا

جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے فضائل وکمالات کی کلیاں اور پھول کھل سکتے ہیں۔

ان مواقع پر ضروری ہے کہ مذہب کو اسکی اصلی شکل میں باقی رکھنے اور اسکے مذہبی پروگرام کو خالص رکھنے کیلئے ایک معصوم پیشوا بعنوان ''محافظ'' موجود رہے تا کہ وہ مذہب کی راہ میں کجی، انحراف، غلط افکار، دوسروں کے ناروا نظریات، توہمات اور خرافات کو شامل نہ ہونے دے، اگر مذہب وشریعت ایک ایسے رہبر کے بغیر رہے تو بہت کم مدت میں ہی اپنی حقیقی شکل وصورت اور خالص حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اللھم بلی، لا تخلوا الارض من قائم اللہ بحجۃ، امّا ظاھراً مشھوراً، او خائفاً مغموراً لئلا تبطل حجج اللہ و بیناتہ"

ہاں، ہرگز زمین حجت الٰہی کے ساتھ قیام کرنے والے سے خالی نہیں ہو سکتی وہ (قیام کرنے والا) چاہے ظاہر وآشکار ہو یا مخفی و پوشیدہ ہو، تا کہ خدا کی دلیلیں اور اسکی واضح نشانیاں باطل نہ ہونے پائیں۔

درحقیقت آئمہؑ کے قلوب اس محفوظ صندوق (safe) کی مثل ہیں جس میں بیش قیمت اسناد کو چوروں کی دسترس و دیگر حوادث سے محفوظ ومصون رکھا جاتا ہے اور یہ چیز وجود امام کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔

۳) امت کی سیاسی واجتماعی قیادت

بلاشک وشبہہ کوئی بھی معاشرہ یا گروہ ایک باصلاحیت [illegible]

نظام کی موجودگی کے بغیر اپنے آپ کو باقی نہیں رکھ سکتا، یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم سے اب تک تمام اقوام اور ملل نے اپنے لیے کسی نہ کسی رہبر کو منتخب کیا ہے، کبھی تو وہ راہنما صالح ثابت ہوا اور اکثر اوقات غیر صالح ثابت ہوا ہے، اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ امتوں کیلئے رہبر کے وجود کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے قدرت پسند لوگ اپنی طاقت اور ریاکاری کے بل بوتے پر لوگوں پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انکے تمام امور کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لے لی...... یہ ایک طرف۔

جبکہ دوسری طرف اگر انسان اپنے روحانی تکامل کے ہدف تک پہنچنا چاہتا ہے، تو اسکے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ہدف کے حصول کی راہ میں تنہا نہ ہو بلکہ اپنے گروہ یا معاشرے کی ہمراہی میں اپنے ہدف کے حصول کیلئے آگے بڑھے کیونکہ ایک معاشرے اور اجتماع کی قوت وتوانائی یقینی طور پر ایک تنہا فرد کی فکری، جسمانی، مادی اور روحانی توانائی سے زیادہ ہے۔

لیکن ایسا معاشرہ ہو کہ اس پر صحیح وعادلانہ نظام حاکم ہو کہ وہ نظام انسانی صلاحیتوں کو نکھارتے ہوئے، کج روی اور انحراف کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے تمام انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرے، اور اعلی ترین مقاصد کے حصول کیلئے منظم پروگرام اور ادارے قائم کرے اور پورے معاشرے کو ایک آزاد ماحول میں اس اعلی ہدف کی خاطر پر جوش تحریک کیلئے آمادہ کرے۔

اس عظیم ذمہ داری کی اہلیت وصلاحیت ایک خطاکار انسان میں یقیناً موجود نہیں ہے کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے اس دنیا کے سیاسی قائدین کے صحیح راستے سے انحراف کا مشاہدہ کر چکے ہیں لھذا ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے اس اہم ذمہ داری اور صحیح نظام کی نگرانی

کے لیئے ایک معصوم رہبر کو مقرر ومعین کیا جائے جو انسانی طاقت اور مفکرین کے افکار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انحرافات کی روک تھام کر سکے۔

امام کے وجود کے فلسفوں میں سے یہ بھی ایک فلسفہ ہے اور ''قاعدہ لطف'' کے شعبوں میں سے ایک شعبہ (Section) ہے۔

ہم دوبارہ عرض کرتے ہیں کہ بعض مخصوص زمانوں میں جب امام معصومؑ غائب ہوں تو اس وقت لوگوں کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی واضح ہو چکی ہیں اور اگر خدا نے توفیق دی تو ''حکومت اسلامی'' سے متعلق گفتگو میں ہم اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

۴) ''اتمام حجت'' کی ضرورت

نا صرف ان قلوب کیلئے کہ جو امامؑ کے وجود مبارک کے ''نور'' سے فیض یاب ہو کر کمال مطلق کے حصول کیلئے کوشاں ہوں بلکہ ان لوگوں کیلئے بھی ''جو جان بوجھ کر غلط راہوں کے راہی ہیں'' (خدا کی طرف سے) اتمام حجت کا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ سزا بے دلیل نہ ہو کہ جسکا انکے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی شخص اس بات پر اعتراض کر سکے کہ اگر آسمانی اور الٰہی رہبروں نے ہمارا ہاتھ تھاما ہوتا اور راہ حق کی طرف راہنمائی کی ہوتی تو ہم ہرگز گمراہ نہ ہوتے۔

خلاصہ یہ کہ ہر عذر اور بہانے کا راستہ بند کر دیا جائے اور حق کو واضح کرنے کیلئے اتنی دلیلیں بیان کی جائیں کہ بے خبر آگاہ ہو اور آگاہ لوگوں کو اطمینان قلب حاصل ہو اور انکے ارادے مضبوط ہو جائیں۔

۵) ''امام'' فیض الٰہی کے حصول کا بڑا وسیلہ

اکثر دانشور'' احادیث اسلامی کی اتباع کرتے ہوئے'' انسانی معاشرے یا تمام کائنات کیلئے پیغمبرؑ یا امام کے وجود کو اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں جسطرح انسانی جسم کیلئے ''دل'' کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

ہمیں علم ہے کہ جس وقت دل دھڑکتا ہے تو خون کو تمام رگوں میں روانہ کرتا ہے جسکے نتیجہ میں بدن کے تمام سیلز (cells) کو غذا حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح امام معصومؑ بھی ایک انسان کامل اور انسانی قافلے کے ''راہنما'' کی حیثیت سے فیض الٰہی کے نزول کا سبب بنتا ہے اور لوگ پیغمبرؑ یا امامؑ سے اپنے اپنے ارتباط کے مطابق کسب فیض کرتے ہیں۔

لھذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جسطرح انسان کیلئے ''دل'' کا ہونا ضروری ہے اسی طرح جہان انسانیت کیلئے امامؑ کا ہونا ضروری ہے تا کہ انسانیت اسؑ کے واسطے اور وسیلے سے فیوض و برکات الٰہیہ کو حاصل کر سکے۔

ایک بات یاد رہے اور وہ یہ کہ پیغمبرؑ یا امامؑ کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے اور جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں وہ صرف اور صرف خدا کی طرف سے ہوتا ہے لیکن جسطرح ''دل'' بدن کیلئے فیض الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے بالکل اسی طرح پیغمبرؑ اور امامؑ بھی تمام انسانوں کیلئے فیض الٰہی کے حصول کا ذریعہ اور واسطہ ہوتے ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) لوگوں کے روحانی تکامل میں امام کا کیا کردار ہے؟

۲) محافظِ شریعت کی حیثیت سے امام کا کیا کردار ہے؟

۳) معاشرہ کے نظام اور حکومت میں قیادت کے حوالے سے امام کا کیا کردار ہے؟

۴) اتمام حجت سے کیا مراد ہے؟ اور اس مسئلہ میں امام کا کردار واضح کریں؟

۵) امام فیض الٰہی کے حصول کیلئے واسطہ ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس نقطۂ نظر سے پیغمبرؑ اور امامؑ کیلئے جو بہترین تشبیہ بیان کی جا سکتی ہے کونسی ہے؟

تیسرا سبق

امام کیلئے ضروری شرائط و خصوصیات

اس بحث میں سب سے پہلے ایک بات کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید ہمیں بخوبی آگاہ کرتا ہے کہ ''مقام امامت'' ایک ایسا اعلیٰ اور عظیم الشان مقام ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ اسی مقام تک پہنچ سکتا ہے، بلکہ یہ مقام نبوت اور رسالت سے بھی بڑھ کر ہے جیسا کہ بت شکن پیغمبر حضرت ابراہیم کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

"و اذا بتلیٰ ابراھیم ربّہٗ بکلمت فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماماً ، قال و من ذریتی ، قال لا ینال عھدی الظٰلمین"

اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند کلمات سے آزمایا اور انہوں نے ان کو پورا کر دکھایا، ارشاد ہوا: میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا: اور میری اولاد سے بھی؟ ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا (اور امامت کے عظیم مقام پر مشرک و گناہوں سے آلودہ شخص فائز نہیں ہو سکے گا)۔

اس طرح سے حضرت ابراہیم نبوت و رسالت اور خدا کے مختلف امتحانات میں کامیابی

کے مراحل طے کرنے کے بعد انسانوں کی ظاہری و باطنی اور مادی و روحانی رہبری کے جلیل القدر اور بلند مقام (یعنی امامت) تک پہنچے۔

پیغمبر اسلام بھی نبوت و رسالت کے علاوہ امامت اور مخلوق کی رہبری کے عظیم الشان منصب پر فائز تھے، بعض دوسرے انبیاءؑ بھی منصب امامت پر فائز تھے یہ بات ایک طرف رہے۔

دوسری طرف ہم اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ کسی بھی عہدہ پر فائز ہونے کیلئے فرائض و ذمہ داریوں کے تناسب سے انسان کیلئے ضروری شرائط و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ اس منصب کے فرائض کو انجام دے سکے، یعنی جتنا زیادہ بلند منصب اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہوں گی اسی تناسب سے ضروری شرائط و صفات بھی زیادہ سنگین ہوتی چلی جائیں گی۔

مثلاً شریعت مقدس اسلام میں کسی شخص کے قاضی بننے، بلکہ گواہ بننے کے لئے اور اسی طرح امام جماعت بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخص عادل ہو، پس جس دین و مکتب میں گواہی دینے کے لئے یا نماز جماعت میں امامت کے فریضہ کو انجام دینے کیلئے ''عدالت'' کا ہونا ضروری ہے، وہاں یقینی طور پر امامت جیسے عظیم الشان منصب تک پہنچے کیلئے انتہائی سخت شرائط ضروری ہوں گی۔

مذکورہ تمہید کی روشنی میں امام کیلئے مندرجہ ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

۱) خطاؤں اور گناہوں سے معصوم ہو

پیغمبر کی طرح امام کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو یعنی گناہ اور خطا [illegible]

محفوظ ہو وگرنہ وہ انسانوں کے لئے رہبر، مثالی نمونہ اور آئیڈل نہیں بن سکتا بلکہ معاشرے کیلئے ایک قابل اعتبار شخص بھی نہیں ہوسکتا۔

امام کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ تمام انسانوں کے دل مسخر کرلے اور اسکا حکم سب کیلئے بغیر کسی پس وپیش کے قابل قبول ہو، لیکن اگر کوئی شخص گناہوں سے آلودہ ہو تو اس کیلئے ہرگز ممکن نہیں ہوگا کہ وہ ایسی مقبولیت حاصل کرسکے اور اسے ہر لحاظ سے قابل اعتماد واطمینان قرار دیا جاسکے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے ذاتی روزمرہ کاموں میں غلطیوں اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ معاشرے کے امور میں اس کے افکار ونظریات پر بھروسہ کرتے ہوئے بغیر کسی پس وپیش کے ان پر عمل کیا جائے؟

بلا شک وشبہ پیغمبر کیلئے معصوم ہونا ضروری ہے اسی طرح مذکورہ دلیل کی روشنی میں امام کیلئے بھی ''معصوم'' ہونے کی شرط ضروری ہے۔

اس بات کو ہم اس طریقے سے بھی ثابت کرسکتے ہیں کہ: پیغمبر وامام کے اصلی وجود کا انحصار ''قاعدہ لطف'' پر ہے اور قاعدہ لطف اس صفت (عصمت) کو واجب وضروری قرار دیتا ہے کیونکہ پیغمبر وامام کے وجود مقدس کے مقاصد کی تکمیل مقام عصمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نیز گذشتہ سبق میں جو فلسفہ ہم نے بیان کیا ہے وہ بھی (اس صفتِ عصمت کے بغیر) ناقص ونامکمل رہ جائے گے۔

۲) مجسّم علم ہونا

پیغمبر کی طرح امام بھی تمام انسانوں کے ہر قسم کے علمی مسائل کے لئے مرجع وپناہ گاہ

ہوتا ہے، اسے تمام اصول وفروع دین، قرآن کریم کے ظاہری وباطنی علم اور سنت پیغمبر نیز اسلام سے مربوط تمام مسائل سے مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ نا صرف شریعت کا محافظ ونگہبان ہے بلکہ انسانوں کا رہبر اور پیشوا بھی ہے۔

ایسے اشخاص جو پیچیدہ مسائل کے پیش آنے پر پریشان ہوجائیں اور دوسروں کی طرف دست سوال دراز کریں اور ان کا علم وشعور اسلامی معاشرے کو پیش آنے والے مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہو وہ ہرگز منصب امامت اور دنیا کی رہبری کے عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتے۔

مختصر یہ کہ امام کیلئے ضروری ہے کہ احکام الٰہی کا لوگوں میں سب سے زیادہ آگاہ اور دانا ہو تاکہ پیغمبر کی رحلت سے پیدا ہونے والے (علمی) خلا کو فوراً (بلا فاصلہ) پر کرسکے اور اسلام کی صحیح راہ کو (جو ہر طرح کے انحرافات سے پاک ہو) ثبات ودوام دے سکے۔

۳) شجاعت

امام کیلئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کا شجاع ترین انسان ہو کیونکہ شجاعت کے بغیر (صحیح) رہبری ممکن نہیں ہے، یہ شجاعت انتہائی سخت وناگوار حالات سے مقابلہ کیلئے، اور طاقتور، سرکش اور ظالم سے مقابلہ کیلئے، اندرونی وبیرونی دشمنوں سے مقابلہ کیلئے ضروری ہے۔

۴) پرہیزگاری اور تقویٰ الٰہی

ہم جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو دنیا کی ظاہری شان وشوکت اور زیبائی میں گرفتار ہوتے

ہیں جلد دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں اور حق وعدالت کی راہ سے ان کے منحرف ہونے کا امکان بھی بہت زیادہ ہوتا ہے، دنیا کی ظاہری شان وشوکت میں گرفتار یہ لوگ کبھی تو طمع اور لالچ کے ذریعے اور کبھی دھمکی کے ذریعے اپنی اصل راہ (راہ مستقیم) سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

امام کیلئے ضروری ہے کہ اس دنیا کی آسائشوں اور نعمتوں کے مقابلہ میں ''اسیر'' بننے کی بجائے ''امیر'' (مستغنی) اور ''فرمانروا'' ہو۔

امام کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس مادی دنیا کی ہر قید وبند سے، نفسانی خواہشات، مقام و درجہ، مال ودولت اور منزلت کی قیود سے آزاد و بے نیاز ہوتا کہ اسے نہ تو فریب دیا جاسکے نہ مغلوب کیا جاسکے اور نہ ہی اسے سازش کے ذریعہ شکست دی جاسکے۔

۵) اخلاقی جاذبیت

قرآن مجید کی سورہ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"فبما رحمة من الله لنت لهم و لو كنت فظاً غليظ القلب لانفضوا من حولك"

(اے رسول) یہ مہر (محبت) الٰہی ہے کہ آپ ان کیلئے نرم مزاج واقع ہوئے اور اگر آپ تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

پیغمبر کی طرح امام، بلکہ ملت کے ہر پیشوا کیلئے پر کشش اخلاق حسنہ کا حامل ہونا

ضروری ہے تا کہ وہ مقناطیس کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

بلاشک وشبہہ ہر قسم کی سختی وبداخلاقی جو کہ انسانوں کو بیزار اور منتشر کرنے کا باعث ہو پیغمبر وامامؑ کیلئے بہت بڑے عیب ہیں اور ان کا ان عیوب سے پاک ہونا ضروری ہے۔

یہ وہ اہم شرائط ہیں کہ جنہیں جید علماء اسلام نے ''امام'' کیلئے ضروری قرار دیا ہے ان پانچ شرائط کے علاوہ امام کیلئے دیگر خصوصیات وشرائط بھی ہیں لیکن ان میں سے اہم یہی تھیں جو بیان کردی گئی ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) دلیل سے ثابت کریں کہ منصب امامت انسان کیلئے ایک اعلیٰ ترین منصب ہے؟

۲) کیا پیغمبر اسلامؐ اور تمام اولوالعزم انبیاء بھی منصب امامت کے حامل تھے؟

۳) اگر امام ''معصوم'' نہ ہو تو کونسی مشکلات پیش آسکتی ہیں؟

۴) امام کیلئے بھرپور علم کا حامل ہونا کیوں ضروری ہے؟

۵) دلیل سے ثابت کریں کہ امام کو سب سے بڑا شجاع، زاہد، نفیس و باوقار اور اخلاقی نقطہ نظر سے سب انسانوں کیلئے جاذب و پرکشش ہونا چاہیے؟

چوتھا سبق

امام کا انتخاب کس کی ذمہ داری ہے؟

مسلمانوں کے ایک گروہ (اہل سنت) کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے جب دنیا سے رحلت فرمائی تو کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا، انکا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے جانشین کا انتخاب لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے اور یہ کام مسلمانوں کے اجماع کے ذریعے (جو کہ شرعی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے) سے انجام پاتا ہے۔

اہل سنت کا کہنا ہے کہ رحلت پیغمبرؐ کے بعد یہ کام انجام پایا اور پہلے خلیفہ، امت کے اجماع سے ہی خلافت کے عہدہ پر منتخب ہوئے تھے۔

جبکہ دوسرے خلیفہ کا انتخاب اجتماع امت کی بجائے پہلے خلیفہ نے ذاتی طور پر خود کروایا۔

جبکہ دوسرے خلیفہ نے اپنے جانشین کے انتخاب کیلئے چھ افراد پر مشتمل ایک شوریٰ (کمیٹی) تشکیل دی اور اس شوریٰ کے ممبران حضرت علی علیہ السلام، عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد ابن ابی وقاص کو قرار دیا۔

اسی شوریٰ نے تین افراد کی اکثریت سے ''یعنی سعد ابن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف

اور طلحہ" عثمان کے لیے اپنی رائے دی (جبکہ دوسرے خلیفہ نے یہ صراحت کردی تھی کہ اگر تین آدمی ایک طرف اور تین آدمی دوسری طرف رائے دیں تو جس طرف عبدالرحمٰن بن عوف (عثمان کے داماد) رائے دیں گے اسی رائے کو تسلیم کیا جائے گا۔

عثمان کی خلافت کے آخری دور میں مختلف وجوہات کی بناء پر مسلمانوں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور اس سے قبل کہ وہ اپنے جانشین کا انتخاب کرتے یا اسکا تقرر کسی شوریٰ کے ذریعے کرواتے ان کو قتل کردیا گیا۔

اس وقت تمام مسلمان حضرت علی علیہ السلام کی طرف بڑھے اور پیغمبرؐ کے جانشین کے طور پر ان کی بیعت کی سوائے شام کے گورنر معاویہ کہ جس نے حضرت علیؑ کی بیعت سے انکار کردیا اور انکے خلاف بغاوت کا علم بلند کردیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ حضرت علی علیہ السلام اسے موجودہ عہدہ پر باقی نہیں رکھیں گے۔

معاویہ کے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے سے تاریخ اسلام میں ناگوار اور مرگ آفرین حادثات کا دور شروع ہوا جسکے نتیجہ میں بے گناہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا خون بہہ گیا۔

یہاں پر علمی اور تاریخی بحثوں کو واضح کرنے کیلئے بہت سے سوالات ابھرتے ہیں جن میں سے چند اہم سوالات یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱) کیا امت کو پیغمبر کا جانشین مقرر کرنے کا حق حاصل ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے۔

'اگر امامت سے مراد مسلمانوں کی ظاہری حکومت ہے تو ایسے حاکم کا انتخاب عوام کی

رائے سے کرنا زمانے کے مروّجہ دستور کے عین مطابق ہے۔

لیکن اگر امامت کو ہم اس معنی میں لیں کہ جسکی وضاحت ہم پہلے قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں کرچکے ہیں تو ہمیں معلوم ہے کہ بلاشک وشبہ ایسے امام اور خلیفہ کو خدا یا اسکے رسولؐ (رسول بھی الہام الٰہی کے بعد) کے علاوہ کوئی بھی شخص معیّن نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ہم پہلے وضاحت کرچکے ہیں کہ امامت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ امام کو اسلام کے تمام اصول اور فروع کا مکمل علم ہونا چاہیے ایسا علم کہ جسکا سرچشمہ علمِ الٰہی اور علم پیغمبرؐ ہوتا کہ وہ شریعتِ اسلام کی مکمل حفاظت کرسکے۔

امامؑ کیلئے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ "معصوم" ہو یعنی ہر طرح کے گناہوں اور خطاؤں سے اسکی خدا کی طرف سے حفاظت ہو تاکہ وہ امامت کے منصب اور امت کی روحانی و مادی اور ظاہری و باطنی رہبری کے عہدہ پر فائز ہوسکے، اور اسی طرح امام کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں زہد وتقویٰ اور پرہیزگاری و بزرگی کی خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود ہوں جو کہ اس عہدہ کیلئے نہایت ضروری ہیں۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ان شرائط کی موجودگی کی تشخیص خدا اور پیغمبرؐ کے علاوہ کسی کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔ وہی (خدا ہی) ہے جو یہ جانتا ہے کہ کس شخص کی روح عصمت کے درجہ پر فائز ہے اور وہی ہے جو یہ جانتا ہے کہ کس شخص میں امامت کے مقام کی اہلیت کیلئے ضروری علم وفضل، زہد وتقویٰ اور شجاعت و بزرگی موجود ہے۔

جن لوگوں نے امام اور خلیفہ پیغمبرؐ کے تقرر کو لوگوں کے سپرد کیا ہے درحقیقت انہوں نے امامت کے صحیح قرآنی مفہوم کو سمجھنے کے بجائے اسے تبدیل کرکے رکھ دیا ہے، انکے خیال میں "امامت" معمول کے مطابق حکمرانی اور دنیاوی [illegible] لوگوں کی رہبری کے

نظام تک محدود ہے وگرنہ امامت کیلئے کسی شخص میں ضروری شرائط کی مکمل اور جامع تشخیص صرف خدا کے ذریعے سے ہی ممکن ہے اور صرف وہی ذات ہے جو ان صفات سے باخبر ہے۔

یہ (امامت کیلئے کسی کا انتخاب) بالکل اسی طرح ہے جیسے پیغمبرؐ کا انتخاب لوگوں کی رائے سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ پیغمبرؐ کا انتخاب خداوند عالم کی طرف سے ہو اور معجزات کے ذریعے سے اسکی پہچان کروائی جائے، اسی طرح پیغمبرؐ میں پائی جانے والی ضروری صفات کی تشخیص بھی صرف خدا ہی کرسکتا ہے۔

۲) کیا پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا؟

بلاشک وتردید "شریعت اسلامی" عالمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا قانون ہے اور قرآن مجید کی متعدد آیات صراحت سے اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ یہ قانون کسی خاص زمانے یا کسی معین جگہ کیلئے ہرگز نہیں ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے زمانہ تک یہ الٰہی آسمانی قانون جزیرہ عرب سے باہر نہیں پہنچا تھا۔

دوسری طرف پیغمبرؐ کی "اعلان نبوت کے بعد کی" زندگی مبارک کے تیرہ برس مکہ میں شرک وبت پرستی سے مقابلہ کرنے میں گذر گئے جبکہ مدنی زندگی کے دس برس کہ جن کا آغاز ہجرت کے وقت سے ہوا اور جو اسلام کے پھلنے پھولنے کا زمانہ تھا وہ بھی زیادہ تر دشمنان اسلام کی طرف سے مسلط کردہ جنگوں اور غزوات کی نذر ہوگئے۔

اگر چہ پیغمبرؐ اپنے شب وروز اسلامی مسائل کی تبلیغ وتعلیم میں خرچ کرتے تھے، اور

اسلام کے تمام شعبوں کی ترویج میں مصروف رہتے تھے لیکن اسکے باوجود اسلام کے بیشتر مسائل کی مکمل تشریح کیلئے زیادہ وقت کی ضرورت تھی لھذا ضروری تھا کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد انہی جیسا کوئی شخص اس اہم ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر کسی مکتب کیلئے آئندہ پیش آنے والے حالات کی پیش گوئی اور اس کی پائیداری اور اسے ہمیشہ باقی رکھنے کیلئے تمام وسائل کی فراہمی ایسے اہم ترین مسائل ہیں کہ جن کے بارے میں ہمیشہ ایک رہبر فکرمند رہتا ہے اور کبھی بھی اس بات کیلئے تیار نہیں ہوتا کہ اس اہم اور بنیادی مسئلہ کو فراموش کردے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ پیغمبر اسلامؐ نے جب زندگی کے معمولی مسائل کے لئے احکامات دیئے تھے تو کیا مسلمانوں کے اس (اہم ترین) مسئلہ "خلافت، رہبری اور امامت کیلئے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہ تھی؟!

ان تینوں وجوہات کا مجموعہ اس بات پر روشن دلیل ہے کہ پیغمبرؐ نے یقیناً اپنے جانشین کو مقرر ومعین فرمایا تھا اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی اس سلسلہ میں اسلام کی ان مسلم روایات کا ذکر کریں گے جو اس منطقی حقیقت کو زیادہ روشن کرسکیں گی کہ پیغمبرؐ اپنی زندگی میں ہی اس اہم مسئلہ سے ہرگز غافل نہیں رہے، اگر چہ آپؐ کی رحلت کے بعد بعض مخصوص سیاسی تحریکوں نے اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ لوگوں کے اذہان میں یہ بات راسخ کردیں کہ پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔

کیا اس بات پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ "رسول خداؐ مدینہ سے چند روز کیلئے جب غزوات (مثلاً غزوہ تبوک) کیلئے باہر تشریف لے جاتے تھے تو مدینہ کو خالی چھوڑنے کی بجائے (کسی نہ کسی کو) اپنا جانشین مقرر فرما کر جاتے تھے" لیکن اسی رسول خداؐ نے اپنی

رحلت کے بعد والے (طویل) زمانے کیلئے کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا؟ اور نہ صرف امت کو اختلافات اور پریشانیوں کے ایک انبوہ میں یونہی چھوڑ دیا بلکہ اسلام کی بقاء کیلئے ہدایت کا بھی کوئی مکمل انتظام نہیں کیا؟!

بلاشک وشبہہ اگر رسولؐ اپنے جانشین کو معین نہ فرماتے تو اپنے قدموں پر تازہ کھڑے ہونے والے اسلام کیلئے شدید خطرات لاحق تھے، اور عقل ومنطق کی رو سے کسی ایسے فعل کا (کہ جس سے اسلام کو خطرات لاحق ہوں) پیغمبر اسلامؐ سے سرزد ہونا ناممکن ہے۔

وہ لوگ جو اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ کام امت کے سپرد کردیا گیا ہے کہ کم از کم کوئی ایک دلیل تو ایسی پیش کریں کہ پیغمبرؐ نے اس بات کی صراحت کردی ہو کہ یہ امت کا کام ہے سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس اپنی اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے کہ جسے وہ پیش کرسکیں۔

۳) اجماع اور شوریٰ

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ''پیغمبر اسلامؐ نے اس اہم ترین مسئلہ (مسئلہ جانشینی جو کہ در حقیقت اسلام کی حیات کا مسئلہ ہے) پر کوئی توجہ نہ کی اور جانشین کے انتخاب کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے کندھوں پر تھی'' تو ہمیں اس بات کا بھی بخوبی علم ہے کہ ''اجماع'' سے مراد تمام مسلمانوں کا اتفاق رائے ہے، لیکن خلیفہ اول کی خلافت کے سلسلہ میں اس طرح کا اتفاق رائے بالکل حاصل نہیں ہوا (مدینہ میں موجود صحابہ کے ایک گروہ نے اس بات کا فیصلہ کیا جبکہ تمام اسلامی شہروں کے لوگوں نے اس فیصلہ میں بالکل شرکت نہیں کی بلکہ مدینہ میں موجود حضرت علیؑ (وجلیل القدر صحابہ) اور بنی ہاشم کے بہت بڑے گروہ نے اس

انتخاب میں سرے سے شرکت ہی نہیں کی یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا ''اجماع'' قطعاً قابل قبول ہی نہیں ہوسکتا۔

اور اسکے علاوہ اگر انتخاب کا یہ طریقہ صحیح تھا تو پھر خلیفہ اول نے اپنے جانشین کے تقرر کے لیے اس طریقے پر عمل کیوں نہیں کیا؟ اور ذاتی طور پر اپنے جانشین کو نامزد کیوں کیا؟ اگر ایک شخص کی طرف سے جانشین کو معیّن کرنا صحیح اور کافی ہوتا تو پیغمبرؐ ''جو کہ سب سے افضل تھے'' اس کام کو انجام دے سکتے تھے اگر خلیفہ اول کی ذاتی رائے سے دوسرے خلیفہ کی بیعت لوگوں کی مشکلات دور کرسکتی ہے تو یہ مسئلہ پیغمبر کے حوالے سے سب سے بہتر حل ہوسکتا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ تیسری مشکل خلیفہ سوم کے سلسلہ میں پیش آئی اور وہ یہ کہ خلیفہ دوم نے ناصرف اس طریقہ انتخاب کو پس پشت ڈال دیا جو خلیفہ اول کے تقرر کے وقت اختیار کیا گیا تھا بلکہ اس سنت کو بھی توڑ دیا جسکے ذریعہ خود مسند خلافت سنبھالی، یعنی خلیفہ دوم نے نہ تو ''اجماع'' پر عمل کیا اور نہ ہی شخصی اور ذاتی نامزدگی کے طریقہ پر عمل کیا بلکہ اس کام کے لئے (ایک محدود) ''شوریٰ'' کو نامزد کردیا۔

اصولی طور پر اگر شوریٰ صحیح ہے تو یہ صرف چھ افراد تک محدود کیوں تھی؟ اور چھ افراد میں سے صرف تین افراد کی رائے ہی کیوں کافی تھی؟

یہ وہ سوالات ہیں جو تاریخ اسلام میں ہر محقق کو پیش آتے ہیں اور ان سوالات کا بے جواب ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رہبر کے مقرر کئے جانے کے یہ طریقے درست نہیں تھے۔

۴) علی علیہ السلام سب سے افضل تھے۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے کسی بھی شخص کا اپنے جانشین کے طور پر تعارف نہیں کرایا تھا اور یہ بھی فرض کریں کہ اس اہم کام کی ذمہ داری لوگوں پر تھی تو کیا یہ صحیح اور عدل کے مطابق ہے کہ جانشین کے انتخاب کے وقت ایک ایسے شخص کو جو علم وتقویٰ اور دیگر امتیازات کی بناء پر سب سے بہتر و برتر ہو اسے نظر انداز کردیا جائے اور ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو ان سے کمتر ہو؟!

تاریخ اسلام کے سب بڑے اہل علم حضرات کہ جن میں اہلسنت کے علماء بھی شامل ہیں سب نے بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت علیؑ اسلامی مسائل کے سب سے بڑے عالم تھے، حضرت علیؑ سے مروی روایات اور انکے آثار اس حقیقت کے تابندہ ثبوت ہیں تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ تمام علمی مشکلات میں آپ امت کے لئے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتے تھے یہاں تک کہ اگر لوگ دیگر خلفاء سے مشکل اور پیچیدہ سوالات کرتے تھے تو خلفاء انکے جواب کیلئے حضرت علیؑ کی طرف رجوع کرتے، شجاعت اور بزرگی، زہد وتقویٰ اور دیگر صفات حسنہ میں آپ لوگوں سے افضل تھے، لھذا اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ امامت یا خلیفہ (جانشین پیغمبرؐ) کے منصب کا انتخاب عوام کو کرنا چاہیے تو حضرت علیؑ سب سے زیادہ اس منصب کے لائق اور شائستہ تھے۔ (ان ابحاث کو ثابت کرنے کیلئے کافی اسناد موجود ہیں جن کا ذکر اختصار کے پیش نظر یہاں پر ممکن نہیں ہے)

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) امام وخلیفۂ پیغمبر کا انتخاب عوام کیوں نہیں کرسکتے؟

۲) پیغمبرؐ نے اپنے لئے جانشین مقرر کیا تھا یا نہیں؟ عقل ومنطق کی رائے کیا ہے؟

۳) پہلے تین خلفاء کے انتخاب کا طریقہ کیا تھا؟

۴) کیا پہلے تینوں خلفاء کے انتخاب کا طریقہ علمی واسلامی اصولوں کے مطابق تھا؟

۵) جن دلائل کی بنیاد پر حضرت علیؑ خلافت کیلئے سب سے زیادہ استحقاق رکھتے تھے انکو ذکر کریں۔

پانچواں سبق

قرآن اور امامت

عظیم آسمانی کتاب ''قرآن مجید'' تمام چیزوں کی طرح مسئلہ امامت میں بھی بہترین راہنما ہے، قرآن مجید نے مسئلہ امامت کا مختلف ابعاد اور پہلوؤں سے تجزیہ کیا ہے۔

۱) قرآن بتاتا ہے کہ ''امامت'' خدا کی طرف سے ہے:

جیسا کہ ہم گذشتہ ابحاث میں حضرت ابراہیمؑ بت شکن کی داستان میں پڑھ چکے ہیں کہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کیلئے عہدہ امامت کو ان کے نبوت و رسالت کے درجہ پر فائز ہونے اور بہت سے عظیم امتحانات میں کامیابی کے بعد کا درجہ قرار دیا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

"و اذ ابتلی ابراھیم ربه بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما"

اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیم کو انکے رب نے چند کلمات سے آزمایا اور انہوں نے ان کو پورا کر دکھایا، ارشاد ہوا میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

مختلف قرآنی آیات اور تاریخی دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مقام امامت پر ''بابل کے بت پرستوں کا مقابلہ کرنے، شام کی طرف ہجرت کرنے، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربان گاہ میں لے جانے کے بعد'' پہنچے تھے۔

جب نبوت اور رسالت جیسے مقام کیلئے ضروری ہے کہ اس کا انتخاب خدا کی طرف سے ہو تو مقام امامت اور کائنات کی رہبری ''جو کہ رہبری کی معراج ہے'' کے لئے بطریق اولی ضروری ہے کہ اسکا انتخاب بھی خدا کی طرف سے ہو کیونکہ یہ کوئی ایسا عہدہ نہیں ہے کہ جسکا انتخاب لوگوں کے ذریعہ سے ممکن ہو۔

علاوہ براین اس منصب (امامت) کے لئے خود قرآن مجید فرما رہا ہے:

"انی جاعلک للناس اماما"

میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں (بقرہ آیت ۱۲۴)

اسی طرح سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۷۳ میں قرآن مجید بعض عظیم پیغمبر حضرات ابراہیم، لوط، اسحاق، یعقوب علیہم السلام کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

"و جعلنا ھم ائمة یھدون بامرنا ......"

اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق راہنمائی کرتے تھے۔

اس سے مشابہ تعبیر بعض دوسری قرآنی آیات میں بھی دیکھنے میں آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس الٰہی منصب کا تقرر خدا کی جانب سے ہونا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم بات جو ہم حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے مربوط آیت کے آخری حصے میں پڑھتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے اپنے بیٹوں اور اپنی آئندہ نسل کے لئے منصب کی درخواست کی تو خدا نے انکے جواب میں فرمایا: لا ینال

عہدی الظالمین (میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا)۔

یہ جواب اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اے ابراہیمؑ آپ کی دعا قبول ہوئی لیکن آپ کے بیٹوں میں سے جس نے ظلم کیا وہ ہرگز اس برتر و اعلی منصب (امامت) پر فائز نہیں ہو سکے گا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ''ظالم'' لغوی اور قرآنی منطق کے اعتبار سے بہت سے وسیع معانی رکھتا ہے جس میں تمام گناہ چاہے وہ شرک ظاہری ہو یا شرک باطنی، اپنے اوپر ظلم ہو یا دوسروں پر ظلم، شامل ہیں۔ اور ان چیزوں کا مکمل علم خدا کے علاوہ کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کیونکہ صرف خدا ہی وہ ذات ہے جو لوگوں کی نیتوں اور انکے باطن سے باخبر ہے ۔اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ منصب امامت کا تقرر صرف خدا کے ہاتھوں میں ہے۔

۲) آیت بلّغ کیوں نازل ہوئی؟

سورہ مائدہ کی آیت ۶۷ میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

"یا یھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته و الله یعصمک من الناس ان الله لا یھدی القوم الکافرین"

اے رسول! جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا، بے شک اللہ کافروں

کی راہنمائی نہیں کرتا۔

اس آیت کے انداز تخاطب سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کے دوش مبارک پر یہ ایک سنگین ذمہ داری تھی اور آپ ہر طرف سے پریشانی میں گھرے ہوئے تھے یہ پیغام ایسا تھا کہ جسکی وجہ سے ممکن تھا آپ کو عوام کے بعض گروہوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑے یہی وجہ تھی کہ آیت مجیدہ میں نا صرف آپ کو اس خاص حکم کے پہچانے کی تاکید کی گئی بلکہ ممکنہ خطرات اور پریشانیوں کے مقابلہ میں بھی اطمینان دلایا گیا۔

یہ بات مسلمہ طور پر قبول شدہ ہے کہ اس اہم مسئلہ کا توحید و شرک یا یہود و منافقین جیسے دشمنوں کے خلاف جہاد سے کوئی ربط نہ تھا کیونکہ سورہ مائدہ کے نزول کے وقت تک یہ مسائل مکمل طور پر حل ہو چکے تھے۔

اس کے علاوہ اسلام کے عام اور معمولی احکامات کی تبلیغ کے سلسلہ میں بھی کوئی زحمت یا پریشانی باقی نہیں تھی، جبکہ آیت میں ایسا حکم تھا کہ جو رسالت کے ہم وزن اور ہم پلہ تھا کہ اگر یہ حکم نہ پہنچایا جاتا تو گویا رسالت کا حق ہی ادا نہ کیا جاتا۔ کیا رسالت کا ہم پلہ مسئلہ پیغمبرؐ کے جانشین اور خلیفہ کے مسئلہ کے علاوہ کوئی اور مسئلہ ہو سکتا ہے؟ (قطعاً نہیں)، بالخصوص جب کہ یہ آیت پیغمبرؐ کی آخری عمر میں نازل ہوئی تھی لہذا جانشینی اور خلافت کے مسئلہ سے بھی مناسبت رکھتی تھی کہ جسکی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ کی نبوت اور رسالت کو دوام حاصل ہونا تھا۔

اس کے علاوہ زید بن ارقم، ابوسعید خدری، ابن عباس جابر بن عبداللہ انصاری، ابو ہریرہ، حذیفہ، ابن مسعود جیسے صحابہ حضرات سے بھی متعدد روایات نقل ہوئی ہیں اور بعض روایات تو ہم تک گیارہ واسطوں سے پہنچی ہیں صحابہ کے علاوہ [illegible]

جن میں مفسرین، محدثین اور مورخین شامل ہیں انہوں نے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور غدیر کے تاریخی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے(۱)

انشاء اللہ ہم بعد میں ''روایات اور سنت'' کے زیر عنوان داستان غدیر کے بارے میں بھی گفتگو کریں گے۔ لیکن اس موقعہ پر یہ یاد دھانی ضروری ہے کہ یہ آیت اس بات کی روشن دلیل ہے کہ پیغمبر گرامی کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی عمر کے آخری حج اور آخری دور میں حضرت علیؑ کو باقاعدہ طور پر جانشین منصوب کریں اور تمام مسلمانوں کو انکا تعارف کروائیں (اور آپؐ نے ایسا ہی کیا)۔

۳) ''اولی الامر کی اطاعت'' کے حکم والی آیت

سورہ نساء کی آیت ۵۹ میں ارشاد ہو رہا ہے:

"یا ایھا الذین امنوا اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم......"

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو......

آیت مجیدہ میں ''اولی الامر کی اطاعت کا حکم'' بغیر کسی شرط اور قید کے خدا اور رسول کی اطاعت کے ہمراہ ہے۔

---

۱) مزید معلومات کیلئے درج ذیل کتب کا مطالعہ کریں: ۱) احقاق الحق ۲) الغدیر ۳) المراجعات ۴) دلائل الصدق۔

اولی الامر سے مراد

کیا یہاں پر ''اولی الامر'' سے مراد ہر زمانے اور ہر ماحول کے فرمانروا اور حاکم ہیں؟ مثلاً کیا ہمارے زمانے میں ہر ملک کے مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے فرمانرواؤں اور حکام کے بغیر کسی شرط و قید کے اطاعت گزار ہو جائیں؟ (جیسا کہ بہت سے اہل سنت مفسرین نے بیان کیا ہے)

(یہ بات عقلی و منطقی اعتبار سے قطعاً قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مختلف ادوار اور زمانے میں حکمرانوں کی اکثریت منحرف، گناہ کار اور ظالم بھی اور ہے)

کیا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر حکمرانوں کا حکم احکام اسلامی کے خلاف نہ ہو تو انکی اطاعت کی جائے؟ یہ بات بھی اس آیت کے اطلاق اور عمومیت کے خلاف ہے۔

کیا اس سے مراد مخصوص صحابہ کرام ہیں؟ یہ تفسیر بھی اس آیت کے وسیع مفہوم'' جو کہ ہر دور اور ہر زمانے کیلئے ہے'' کے خلاف ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر ہمارے لئے یہ بات واضح ہے کہ ''اولی الامر سے مراد وہ معصوم پیشوا ہیں کہ جن کا وجود ہر زمانے میں ہے اور جن کی پیروی کسی قید اور شرط کے بغیر ضروری و لازم ہے اور جن کا حکم تسلیم کرنا خدا اور رسولؐ کے حکم کو تسلیم کرنے کی طرح ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی مآخذ میں موجود متعدد احادیث کہ جن میں ''اولی الامر'' کی تطبیق حضرت علی اور آئمہ معصومین سے کی گئی ہے بھی اس حقیقت کی گواہ ہیں۔

۴) آیت ولایت

سورہ مائدہ کی آیت ۵۶ میں ارشاد خداوندی ہے۔

"انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین امنوا الذین یقیمون الصلوۃ و یؤتون الزکوۃ و ہم راکعون"

تمھارا ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

عربی لغت میں کلمہ ''انما'' انحصار (کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر منحصر کردینا) کیلئے آتا ہے۔ قرآن کلمہ ''انما'' کیساتھ تاکید کرتے ہوئے کہہ رہا کہ مسلمانوں کے ولی اور سرپرست صرف تین ہیں: خدا، پیغمبرؐ اور وہ لوگ جو ایمان لائے نماز قائم کی اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

بلاشک وشبہ ولایت سے مراد مسلمانوں کی باہمی دوستی نہیں ہے کیونکہ اسکے لئے اس قید اور شرط کی ضرورت نہیں ہے، تمام مسلمان ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں خواہ وہ حالت رکوع میں زکوۃ نہ بھی دیتے ہوں۔

لھذا ''ولایت'' سے مراد ''وہی مادی اور روحانی سرپرستی ورہبری ہے'' خصوصاً جبکہ اولی الامر کی ولایت خدا اور پیغمبر کی ولایت کے ہمراہ ذکر کی جارہی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ آیت ولایت میں جن اوصاف کا ذکر ہوا ہے وہ ایک ایسے شخص کی طرف اشارہ کررہے ہیں جس نے حالت رکوع میں زکوۃ ادا کی ہے ورنہ ضروری نہیں ہے کہ انسان نماز میں رکوع کی حالت میں زکوۃ ادا کرے، حقیقت میں یہ آیت اس شخص کی فضیلت کی بجائے اسکی نشاندہی کررہی ہے۔

ان تمام قرائن اور شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیتِ ولایت حضرت علی علیہ

السلام کی مشہور داستان کی طرف ایک بہت ہی پر معنی اشارہ ہے کہ جب حضرت علیؑ نماز میں مشغول تھے کہ اسی اثناء میں ایک حاجت مند نے مسجد نبوی میں داخل ہوکر امداد کا تقاضا کیا، کسی نے بھی اسکو مثبت جواب نہ دیا اسی حالت میں حضرت علیؑ نے اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے اسے اشارہ کیا وہ آپ کے قریب آیا اور آپؑ کے ہاتھ سے بیش قیمت انگوٹھی اتار کر لے گیا، پیغمبرؐ ''جو کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کررہے تھے'' نے نماز کے بعد سر آسمان کی طرف بلند کرکے فرمایا: میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے دعا کی تھی کہ تو انکی روح (سینے) کو کشادہ ان کے تمام امور کو آسان اور انکی زبان کی گرہ کو کھول دے اور ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر و مددگار بنادے۔ خداوندا! میں محمدؐ تیرا پیغمبر اور برگزیدہ ہوں، میرے سینے کو وسیع کردے اور میرے اوپر تمام امور کو آسان کردے۔ میرے خاندان میں سے علی کو میرا وزیر بنادے تا کہ اس کو ذریعے میری کمر قوی اور مضبوط ہوجائے۔

ابھی پیغمبرؐ کی دعا تمام نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیلؑ آیت ولایت لیکر نازل ہوگئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اہل سنت کے بہت سے بڑے بڑے مفسرین، محدثین اور مورخین نے بھی آیت ولایت کے نزول کو حضرت علیؑ کی شان میں قرار دیا ہے اور اصحاب رسول میں سے دس سے زیادہ صحابہ نے اس حدیث کو پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے۔

ولایت کے موضوع پر قرآن میں بہت سی آیات ذکر ہوئی ہیں مگر ہم کتاب کے اختصار کے پیش نظر صرف چار مذکورہ آیات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) قرآن کی نظر میں امام کا انتخاب اور تعیین کس کی ذمہ داری ہے؟

۲) آیہ بلاغ کن حالات میں نازل ہوئی؟ اور اس میں کیا حکم دیا گیا تھا؟

۳) کن شخصیات کی اطاعت بلاقید وشرط عقل کے مطابق ہے؟

۴) کیا آیت انما ولیکم ا...... میں رہبری و امامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے دلیل پیش کریں؟

۵) مسئلہ ولایت کے بارے میں تمام قرآنی آیات سے کن مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟

چھٹا سبق:

امامت، سنت پیغمبرؐ کی روشنی میں

اسلامی کتب احادیث کے مطالعہ کے وقت خصوصاً اہل سنت بھائیوں کی احادیث کے مآخذ میں پیغمبر اسلامؐ سے احادیث کی ایک کثیر تعداد منصب امامت وخلافت کو حضرت علی علیہ السلام کیلئے ثابت کرتی ہے۔

انسان حیرت کے دریا میں ڈوب جاتا ہے کہ ان تمام احادیث کی موجودگی میں تو امامت کے حوالے سے جائے تردید وشک باقی نہیں رہ جاتی، کہاں یہ کہ ایک گروہ چاہے کہ اہل بیت سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرے۔

ان احادیث میں سے بعض کی سینکڑوں اسناد موجود ہیں جیسے حدیث غدیر اور بعض کی دسیوں اسناد ہیں اور یہ تمام احادیث اپنی اسناد سمیت دسیوں مشہور اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں یہ احادیث اس قدر واضح ہیں کہ اگر ہم تمام ابحاث کو نظر انداز بھی کردیں پھر بھی یہ مسئلہ اتنا واضح وروشن ہے کہ کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

احادیث کے اس خزانے سے کچھ احادیث ہم لطف ... پیش کرتے ہیں جو

حضرات جو اس موضوع پر مزید گہرائی تک مطالعہ کے خواہشمند ہوں ان کے لئے ہم بعض اہم کتب کی نشاندہی کرتے ہیں تا کہ وہ ان سے استفادہ کرسکیں (۱)

۱) حدیث غدیر

مورخین اسلام کی ایک بہت بڑی تعداد نے لکھا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ اپنی زندگی کے آخری سال حج کیلئے مکہ تشریف لے گئے، اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد آپؐ اپنے پرانے اور نئے ساتھیوں اور اسلام کے جانثار شیدائی مسلمانوں (جو کہ حجاز کے گوشہ گوشہ سے مراسم حج کی ادائیگی کیلئے آپؐ کے ہمراہ تھے) کے عظیم اجتماع کیساتھ مکہ سے واپسی کے وقت ''جحفہ'' سے گزرتے ہوئے خشک اور گرم بیابان ''غدیر خم'' (جو کہ ایک چوراہا تھا اور جہاں سے حجاز کے تمام لوگوں کے راستے جدا ہوتے تھے) کے مقام پر پہنچے۔

اس سے پہلے کے تمام مسلمان حجاز کے مختلف مقامات کیلئے یہاں سے جدا ہو جاتے پیغمبرؐ نے اپنے ساتھیوں کو رکنے کا حکم فرمایا اور جو لوگ قافلے کے آگے آگے چل رہے تھے ان کو واپس آنے کا حکم دیا جبکہ پیچھے آنے والے لوگ بھی قافلے میں آ شامل ہوئے، فضا بے حد گرم اور تپش بہت زیادہ تھی جبکہ اس بیابان میں دور تک کوئی سایہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، مسلمانوں نے پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ نماز ظہر ادا کی اور جیسے ہی انہوں نے اپنے اپنے خیموں میں جانے کا پروگرام بنایا پیغمبرؐ نے اعلان فرمایا کہ سب ایک نئے اور اہم الٰہی پیغام کو سننے کیلئے جو کہ ایک طویل خطبے کے دوران دیا جائے گا تیار ہو جائیں۔

---

۱) زیادہ وضاحت کیلئے کتاب المراجعات، ترجمہ الغدیر اور نوید امن و امان کی طرف رجوع کریں۔

چار اونٹوں کے پالانوں سے ایک منبر تیار کیا گیا اور اس پر پیغمبر اسلامؐ تشریف فرما ہوئے، آپؐ نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے یوں فرمایا:

میں خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جلد ہی تمھارے درمیان سے رخصت ہونے والا ہوں میں خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں، اور تم بھی جواب دہ ہو تم میرے بارے میں کس طرح کی گواہی دو گے؟

تمام لوگوں نے بیک زبان بلند آواز سے کہا: نشہد انک قد بلغت ونصحت و جہدت فجزاک اللہ خیرا

ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے رسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے اور ہماری بھلائی کیلئے ہمیں نصیحت کی ہے اور ہماری ہدایت کی راہ میں بے حد زحمات برداشت کی ہیں خدا آپ کو جزاء خیر دے۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم سب خدا کی وحدانیت میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس روز مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی گواہی دیتے ہو؟ سب نے بیک زبان کہا! ہم گواہی دیتے ہیں آپؐ نے فرمایا! خداوندا گواہ رہنا......

آپؐ نے دوبارہ گفتگو شروع کی: اے لوگو! کیا تم سب میری آواز سن رہے ہو؟ سب نے کہا ہاں اسکے بعد سارے بیابان میں ایک ایسی خاموشی چھائی کہ ہوا کی سنسناہٹ کی آواز کے علاوہ دوسری کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: اب بتاؤ ان دو عزیز ترین اور گرانقدر چیزوں کیساتھ کیا سلوک کرو گے جو کہ میں تمھارے درمیان بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں؟ مجمع میں سے ایک آواز بلند ہوئی! یا رسول اللہ وہ دو گرانقدر چیزیں کونسی ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: پہلی گرانقدر چیز "ثقل اکبر" یعنی کتاب الٰہی "قرآن" ہے اسکے دامن کو مضبوطی سے تھام کر رکھنا تاکہ گمراہی سے بچے رہو، اور دوسری گرانقدر اور عظیم یادگار چیز "میرے اہل بیت (ع)" ہیں اور خداوند لطیف وخبیر نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ یہ دونوں مجھ سے ہرگز جدا نہ ہونگے یہاں تک کہ جنت میں میرے ساتھ آملیں گے ان دونوں (قرآن واہل بیت) پر ہرگز سبقت نہ کرنا ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا کیونکہ اس صورت میں بھی ہلاک ہوجاؤ گے؟

اس دوران یکایک آپ نے کسی کی تلاش میں اردگرد اپنی نظریں دوڑائیں اور جیسے ہی آپ کی نظر حضرت علیؑ پر پڑی آپؐ نے جھک کر حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں اس قدر بلند کیا کہ آپ دونوںؑ کی بغلوں کی سفیدی نمایاں ہوگئی اور سب لوگوں نے نا صرف حضرت علیؑ کو دیکھا بلکہ انکو پہچانا۔

اس موقع پر آپؐ کی آواز زیادہ بلند ہوئی اور آپؐ نے فرمایا: ایہا الناس من اولی الناس بالمومنین من انفسھم ؟ لوگوں میں سے کون شخص مومنین پر خود ان کی نسبت سے بھی زیادہ حق رکھتا ہے؟ سب نے کہا! خدا اور اسکا رسول بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا! خدا میرا رہبر و مولی ہے اور میں مومنین کا حاکم اور رہبر ہوں اور ان کی نسبت سے میں سب سے زیادہ حق رکھتا ہوں اسکے بعد فرمایا:

"من کنت مولاہ فعلی مولاہ"

ہر وہ شخص جسکا میں رہبر و مولی ہوں علی اسکے رہبر و مولا ہیں۔

آپؐ نے اس بات کو تین مرتبہ اور بعض راویان حدیث کے مطابق چار مرتبہ دھرایا اور اس کے بعد اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کیا اور فرمایا:

"اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ و احبّ من احبّہ و ابغض من ابغضہ و انصر من نصرہ و اخذل من خذلہ و ادر الحق معہ حیث دار"

"خداوندا اس کے دوستوں کو دوست رکھ اور اس کے دشمنوں کو دشمن اس شخص کو محبوب رکھ جو اس کو محبوب رکھے اور اس شخص پر غضب نازل فرما جو اس سے کینہ رکھے، اس کے مددگاروں کی مدد فرما اور اس کے ساتھ چھوڑنے والوں کو تو بھی محروم فرما اور جدھر جدھر وہ جائے حق کو بھی اسی طرف موڑ دے"

اسکے بعد آپؐ نے فرمایا: تمام حاضرین اس پیغام کو ان افراد تک پہنچادیں جو یہاں پر موجود نہیں ہیں۔

ابھی مسلمانوں کی صفیں قائم تھیں کہ وحی خدا کے امین حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور یہ آیت پیغمبرؐ تک پہنچائی:

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ......" (المائدہ آیت ۳)

آج کے دن میں نے تمھارے لئے تمھارے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کردیا......

اس موقع پر پیغمبرؐ نے فرمایا:

اللہ اکبر اللہ اکبر، علی اکمال الدین و اتمام النعمۃ و رضی الرّب برسالتی و الولایۃ لعلی من بعدی

خدایا تیری کبریائی کا اعلان کرتا ہوں خدایا تیری کبریائی کا اعلان کرتا ہوں اس بات پر کہ تو نے اپنے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کر دیا اور تو نے میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت سے اپنی خوشنودی کا اعلان کیا۔

اس وقت لوگوں کا ایک شور بلند ہوا تھا اور سب لوگ حضرت علیؑ کو اس منصب کی مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ ان میں سے حضرات ابوبکر اور عمر نے تمام مجمع کے سامنے حضرت علیؑ سے یہ جملہ کہا:

بخ بخ لک یا بن ابی طالب اصبحت و امسیت مولای و مولا کل مومن و مومنة.

آپ کو مبارک ہو مبارک ہو اے فرزند ابوطالبؑ آپ میرے حاکم و رہبر اور تمام مومنین و مومنات کے رہبر و حاکم ہو گئے ہیں۔

حدیث غدیر کی سند

اسلامی تاریخ کے مختلف دانشور حضرات کے ایک بہت بڑے گروہ نے حدیث غدیر کو مختلف عبارات کیساتھ، کہیں تفصیل کیساتھ اور کہیں انتہائی اختصار کیساتھ اپنی کتب میں بیان کیا ہے، حدیث غدیر ان متواتر احادیث میں سے ہے کہ جس کے پیغمبرؐ سے بیان ہونے کی کوئی شخص بھی تردید نہیں کر سکتا، جلیل القدر مصنف و محقق "علامہ امینی" نے اس حدیث کو اپنی مشہور کتاب الغدیر میں پیغمبرؐ کے ایک سو دس اصحاب اور تین سو ساٹھ مشہور مصنفین کی کتابوں سے نقل کیا ہے، نیز یہ حدیث برادران اہل سنت کی تفسیر، تاریخ اور

حدیث کی اکثر کتابوں میں بیان کی گئی ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ علمائے اسلام کے ایک بڑے گروہ نے خاص طور پر اس حدیث کے بارے میں مستقل کتابیں تحریر کی ہیں انہی میں سے "علامہ امینی" نے ایک گرانقدر اور کم نظیر کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور اس کتاب میں ان چھبیس (۲۶) علمائے اسلام کے نام لکھے ہیں کہ جنہوں نے "حدیث غدیر" کے موضوع پر الگ اور مستقل کتابیں تحریر کی ہیں۔

حدیث غدیر میں "مولا" کا معنی

بعض حضرات چونکہ حدیث غدیر کی سند کا انکار نہیں کر سکتے تھے لھذا انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حدیث امامت یا خلافت کے موضوع پر ہرگز دلالت نہیں کرتی بلکہ اس حدیث میں "مولا" سے مراد "دوست" ہے، حالانکہ حدیث کے مضمون پر توجہ کرنے اور اس کے ارشاد کے مقام اور وقت نیز دیگر حالات و قرائن بخوبی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اس حدیث کا مقصد صرف اور صرف مسئلہ امامت و ولایت بمعنی مکمل رہبری تھا ان میں سے کچھ قرائن درج ذیل ہیں:

الف: آیت "تبلیغ" کہ جسکا بیان گذشتہ بحث میں گزر چکا ہے وہ اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی تھی اسکا تند و تیز لہجہ خطاب اور اس میں موجود قرائن و شواہد اس بات کے بخوبی گواہ ہیں کہ یہ گفتگو کسی "عام دوستی" اور "رفاقت" کیلئے ہرگز نہ تھی کیونکہ اس رفاقت اور دوستی کیلئے اس قسم کا اہتمام اور اسکی اتنی اہمیت اور تاکید ضروری نہ تھی، اسی طرح آیت "اکمال دین" جو کہ اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی اس بات کی گواہی ہے کہ پیغمبر کی رہبری اور جانشینی کا مسئلہ یقیناً غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کہ جسکی [illegible] تمام گفتگو کی گئی

ب: ان تمام مقدمات کے ساتھ اس تپتے ہوئے بیابان میں اس تفصیلی خطبہ کے ہمراہ لوگوں سے اقرار لینا اور وقت وجگہ کے ان حساس حالات میں حدیث غدیر کو بیان کرنا یہ سب چیزیں ہمارے مدعیٰ پر محکم دلائل ہیں۔

ج: مختلف گروہوں، اشخاص اور جلیل القدر صحابہ کی حضرت علیؑ کو مبارک باد کے علاوہ اس روز کہے گئے شعراء کے اشعار اور اس کے بعد (سے آج تک) کہے گئے اشعار یہ تمام چیزیں اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ یہ گفتگو حضرت علیؑ کے امامت وولایت کے بلندو بالا منصب کیلئے منتخب ہونے کے سلسلہ میں تھی۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) داستان غدیر کی تشریح کریں؟

۲) حدیث غدیر پیغمبر اسلامؐ سے کتنی اسناد اور کتنی مشہور اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہے؟

۳) حدیث غدیر میں ''مولا'' کا معنی رہبر وامام کیوں ہے؟ دوست کیوں نہیں؟

۴) واقعہ غدیر کے بعد پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کیلئے کیا دعا فرمائی؟

۵) مقام ''غدیر'' اور ''جحفہ'' کہاں پر واقع ہیں؟

ساتواں سبق

"حدیث منزلت" اور "حدیث یوم الدار"

بڑے بڑے اہل تشیع اور اہل سنت مفسرین حضرات نے سورہ اعراف کی آیت ۱۴۲ کے ذیل میں اس مشہور "حدیث منزلت" کو نقل کیا ہے یاد رہے کہ سورہ اعراف کی آیت ۱۴۲ میں حضرت موسیٰ کے چالیس راتوں کیلئے کوہ طور پر جانے اور حضرت ہارون کے انکا جانشین ہونے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

حدیث منزلت کا واقعہ یوں ہے کہ: پیغمبر اسلام کو خبر دی گئی کہ مشرقی روم کے بادشاہ نے حجاز، مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا ہے تاکہ اس اسلامی انقلاب کو جو کہ انسانیت کی فلاح اور حصول آزادی کے ایک مخصوص پروگرام کے ساتھ واقع ہوا تھا اپنی مملکت کی سرحدوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی ختم کردے۔

آپ نے اس بڑے لشکر کا مقابلہ کرنے کیلئے سرحدی مقام "تبوک" (جو کہ جزیرہ نما عرب کے شمال میں شرقی روم کے بادشاہ کی سلطنت کی سرحد پر واقع تھا) کے میدان میں جانے کا فیصلہ کیا، آپ نے حضرت علیؑ کو مدینہ میں اپنے جانشین کے طور پر رکنے کا حکم فرمایا اس موقع پر حضرت علیؑ نے آپؐ سے عرض کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں کے درمیان چھوڑ دیں گے؟ (اور اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ آپ کے ساتھ میدان

جہاد میں جاؤں اور اس عظیم افتخار کو حاصل کرسکوں؟) پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا:

"الا ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسی الا انه لا نبی بعدی"

"کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہما السلام سے تھی؟ مگر یہ کہ میرے بعد سلسلہ نبوت ختم ہونے والا ہے"

مذکورہ حدیث اہل سنت کی مشہور ترین احادیث کی کتابوں مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے، صحیح بخاری میں اس حدیث کا مکمل متن ذکر کیا گیا ہے جبکہ صحیح مسلم میں ایک مرتبہ مکمل متن جبکہ دوسری مرتبہ صرف اس جملہ " انت منی بمنزلة هارون من موسی الا انه لا نبی بعدی" کو ایک کلی اور عام کلمہ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے(۱)

اسکے علاوہ یہ حدیث اہل سنت کی بہت سی کتب مثلاً "سنن ابن ماجہ" "سنن ترمذی"، "مسند احمد" اور بہت سی کتابوں میں نقل ہوئی ہے جبکہ بیسیوں افراد کہ جن میں" جابر بن عبداللہ انصاری، ابوسعید خدری، عبداللہ بن مسعود اور (یہانتک کہ) معاویہ" وغیرہ شامل ہیں نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔

"تاریخ بغداد" میں ابوبکر بغدادی نے اس حدیث کو "عمر بن خطاب" سے یوں نقل کیا ہے: عمر بن خطاب نے ایک شخص کو دیکھا جو کہ حضرت امیر المومنین علیؑ کے خلاف بکواس

---

۱) صحیح بخاری ج/۶ صفحہ ۳، صحیح مسلم ج/۱ صفحہ ۴۴ و جلد ۴ صفحہ ۱۸۷۔

کر رہا تھا عمر نے اس سے کہا: تم مجھے منافق معلوم ہوتے ہو کیونکہ میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ: انما علی منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی، علی کی میرے ساتھ نسبت ویسے ہی ہے جیسے ہارون کی موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں ہے۔(۱)

یہاں پر اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ معتبر ترین اسلامی ماخذ کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے یہ بات (حدیث منزلت) صرف جنگ تبوک کے موقعہ پر نہیں فرمائی بلکہ سات مختلف مواقع پر یہ ارشاد فرمایا ہے جو کہ اس حدیث کے عام اور واضح مفہوم پر دلالت ہے وہ سات مواقع درج ذیل ہیں:

۱) ''پہلی اخوت کے دن'' یعنی مکہ میں جب پیغمبرؐ نے لوگوں کے درمیان اخوت کا رشتہ قائم کیا تو اس وقت اس عہد و پیمان میں علیؑ کو اپنے بھائی کے طور پر منتخب فرماتے ہوئے یہی جملہ ارشاد فرمایا۔

۲) ''دوسری اخوت کے دن'' جب مہاجرین اور انصار کے درمیان مدینہ میں اخوت کا عہد و پیمان انجام پایا تو دوبارہ آپؐ نے حضرت علیؑ کا انتخاب اپنے بھائی کے طور پر فرماتے ہوئے یہی جملہ ارشاد فرمایا:

۳۔ جب مسجد نبوی میں کھلنے والے لوگوں کے دروازے آپؐ نے بند کروا دیئے اور صرف حضرت علیؑ کے گھر کے دروازے کو کھلا رکھا تو اس موقع پر بھی آپ نے یہی ارشاد فرمایا۔

---

۱) تاریخ بغداد ج/۷ صفحہ ۴۵۲

۴، ۵، ۶، ۷۔ غزوہ تبوک اور تین دوسرے مواقع پر کہ جنکی اسناد اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہیں آپؐ نے یہی ''حدیث منزلت'' ارشاد فرمائی۔

لھذا حدیث منزلت کی تردید نہ تو سند کے اعتبار سے کی جاسکتی ہے اور نہ ہی عام مفہوم کے اعتبار سے۔

حدیث منزلت کا مضمون

اگر اپنے ذاتی نظریات و خیالات سے قطع نظر غیر جانبداری سے حدیث منزلت کا تجزیہ کریں تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل کے درمیان وہ تمام مراتب اور منصب جو حضرت ہارون کو حاصل تھے حضرت علیؑ بھی نبوت کے علاوہ ان تمام عہدوں اور مناصب کے حامل تھے کیونکہ حدیث میں ''نبوت کے نہ ہونے'' کی قید و شرط کے علاوہ اور کوئی قید موجود نہیں ہے لھذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ:

۱) پیغمبرؐ کے بعد امت مسلمہ میں سب سے افضل حضرت علیؑ تھے (اور حضرت ہارونؑ کو بھی حضرت موسیٰؑ کے بعد یہی مقام حاصل تھا)

۲) علیؑ پیغمبرؐ کے وزیر، ان کے معاونِ خاص اور ان کی رہبری کے جزو لاینفک تھے کیونکہ قرآن مجید سورہ طٰہٰ کی آیات ۲۹ اور ۳۲ تک حضرت ہارون کیلئے ان تمام عہدوں کا تذکرہ کرتا ہے۔

۳) علیؑ پیغمبرؐ کے جانشین اور خلیفہ تھے اور آپؑ کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص اس عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتا اسی طرح حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کیلئے تھے۔

حدیث یوم الدار

اسلامی تواریخ کے بیان کے مطابق نبوت پر مبعوث ہونے کے تین سال بعد آپؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ اب اپنی خفیہ دعوت کو آشکار فرمادیں۔

چنانچہ سورہ شعراء کی آیت ۲۱۴ میں ارشاد ہوا:

"و انذر عشیرتک الاقربین"

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب خدا سے ڈرائیں"

لھذا آپ نے حکم خدا سے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اپنے چچا حضرت ابو طالبؑ کے گھر کھانے کی دعوت دی اور اس کے بعد فرمایا: "اے عبدالمطلبؑ کے فرزندو! خدا کی قسم عرب میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنی قوم کیلئے کوئی ایسی چیز لایا ہو جو میری لائی ہوئی چیز (اور نعمت) سے بہتر ہو، میں تمھارے لئے دنیا و آخرت کی نیکیاں اور بھلائیاں لے کر آیا ہوں اور خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ تمھیں اس قانون کی (قبولیت کی) طرف دعوت دوں تم میں سے کون ہے جو میرا مددگار رہے تا کہ وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین بن سکے؟

کسی بھی شخص نے اس دعوت پر لبیک نہیں کہی سوائے حضرت علیؑ کے اگرچہ آپ سب سے زیادہ کمسن تھے لیکن پھر بھی آپ کمال شجاعت سے کھڑے ہوئے اور عرض کی: "اے اللہ کے رسول! میں اس راہ (اسلام) میں آپ کا دوست اور مددگار رہوں"۔ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کی گردن پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا!

"ان هذا اخی و وصی و خلیفتی فیکم،
فاسمعوا له و اطیعوه"

"یہ میرا بھائی، وصی اور تمھارے درمیان میرا جانشین ہے اسکی بات کو توجہ سے

سنو اور اسکے حکم کی اطاعت کرو"

لیکن گمراہ قوم قریش نے نہ صرف پیغمبر کی بات ماننے سے انکار کردیا بلکہ آپ کا مذاق بھی اڑایا۔

مذکورہ حدیث جو کہ حدیث "یوم الدار" (گھر پر دعوت کے دن والی حدیث) کے نام سے معروف ہے کافی حد تک حضرت علیؑ کی جانشینی کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے۔ جبکہ سند کے اعتبار سے بھی اہل سنت کے بڑے بڑے علماء نے اسکو اپنی کتب میں نقل کیا ہے ان علماء میں ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابو نعیم بیہقی، ثعلبی، طبری، ابن اثیر، ابو الفداء اور دیگر بہت سے علماء شامل ہیں۔

اگر ہم حدیث "یوم الدار" پر غیر جانبدارانہ غور و فکر کریں تو حضرت علیؑ کی ولایت و خلافت سے متعلق بہت سے حقائق واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ اس میں مسئلہ خلافت و ولایت کا ذکر واضح طور پر کیا گیا ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) حدیث منزلت سے کیا مراد ہے اور بتائیں کہ یہ کتنے مقامات پر بیان کی گئی ہے؟

۲) حدیث منزلت حضرت علیؑ کیلیے کن فضائل اور مناصب کو ثابت کرتی ہے؟

۳) قرآن نصوص کے مطابق حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کی نسبت سے کیا مقام حاصل تھا؟

۴) حدیث منزلت کو کن علماء نے ذکر کیا ہے؟

۵) حدیث یوم الدار، اسکا معنی اور مفہوم، اسکی سند اور اسکے ذریعہ حاصل کردہ نتیجہ بیان کریں؟

آٹھواں سبق

حدیث ثقلین اور حدیث سفینہ

حدیث ثقلین کی اسناد

علماء اہل سنت و اہل تشیع کے درمیان مشہور و معروف احادیث میں سے ایک حدیث ثقلین ہے۔

اس حدیث کو صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد نے پیغمبرؐ سے بلاواسطہ نقل کیا ہے، بعض بزرگ علماء نے اس حدیث کے راویوں کی تعداد تیس سے زیادہ بیان کی ہے(۱)

مفسرین، محدثین اور مورخین کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس حدیث کو اپنی کتب میں یوں پے در پے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کے ''متواتر'' ہونے میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں ہے۔

بزرگ عالم سید ہاشم بحرانی نے اپنی کتاب ''غایۃ المرام'' میں اس حدیث کو علمائے اہل سنت کی ۳۹ اور علماء شیعہ کی ۸۰ اسناد کیساتھ نقل کیا ہے جبکہ بزرگ عالم علامہ میر حامد حسین

---

۱) سید علی جلد ۲۳ صفحہ ۳۰۸

ہندی نے اس سلسلہ میں مزید تحقیق اور جستجو کے بعد تقریبا دو سو علماء اہل سنت سے اس حدیث کونقل کیا ہے اور اس حدیث کے بارے میں اپنی ساری تحقیق کو چھ جلدوں کی ایک بڑی کتاب (عبقات الانوار) میں جمع کیا ہے!

مشہورترین صحابہ کہ جنہوں اسے نقل کیا ان میں سے ابوسعید خدری ، ابوذر غفاری، زید بن ارقم ، زید بن ثابت ، ابورافع ، جبیر بن مطعم ، حذیفہ یمانی ،ضمرہ اسلمی ، جابر بن عبداللہ انصاری اور حضرت ام سلمہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ اس حدیث کو خانہ کعبہ میں لوگوں کے سامنے کھڑے ہوکر ان الفاظ میں بیان کرر ہے تھے:

میں نے پیغمبر اسلام سے سنا تھا کہ وہ فرمار ہے تھے:

"انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی :
و انہما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض"!

میں تمھارے درمیان دو گرانقدر یادگار چیزیں چھوڑے جارہا ہوں''قرآن'' اور میرے اہل بیت یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہونگے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں گے، پس تم انکا خیال رکھنا اور دیکھنا تم میری سفارش کا انکے بارے میں کس قدر لحاظ کرتے ہو۔

یہ روایت اہل سنت کے معتبر ترین ماخذ مثلاً صحیح ترمذی ،نسائی ،مسند احمد ، کنز العمال ، اور مستدرک حاکم وغیرہ میں نقل ہوئی ہے۔

بہت سی روایات میں ''ثقلین'' کی تعبیر یعنی دو گرانقدر چیزیں اور بعض روایات میں خلیفتین کی تعبیر یعنی'' دو جانشین'' آئی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے ان میں کسی خاص قسم کا

فرق نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ: مختلف اسلامی احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اس روایت ''حدیث ثقلین'' کو مختلف مواقع پر لوگوں کے گوش گزار کروایا ہے: جابر بن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ سفر''حج''میں عرفہ کے دن یہ حدیث ارشاد فرمائی۔

عبداللہ بن حطب فرماتے ہیں آپ نے یہ حدیث ''جحفہ'' کے مقام پر ارشاد فرمائی (جحفہ مکہ اور مدینہ کے مقام پر ایک جگہ کا نام ہے کہ جہاں سے بعض ممالک کے حاجی احرام باندھتے ہیں)۔

حضرت''ام سلمی'' فرماتی ہیں کہ آپ نے یہ حدیث غدیر خم کے مقام پر ارشاد فرمائی۔

جبکہ بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنی زندگی مبارک کے آخری دنوں میں بستر علالت پر یہ حدیث ارشاد فرمائی۔ایک اور حدیث کے مطابق آپ نے مدینہ میں منبر پر یہ حدیث ارشاد فرمائی ہے(۱)۔

اہل سنت کے معروف عالم'' ابن حجر نے اپنی کتاب ''صواعق المحر قہ'' میں تو پیغمبر اسلامؐ سے یہاں تک نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اس حدیث ثقلین کو بیان کرنے کے بعد علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا: یہ علی قرآن کیساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ ہے قرآن اور علی آپس میں جدا نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں گے(۲)۔

---

۱) المراجعات صفحہ ۴۲

۲) صواعق المحرقہ صفحہ ۷۵۔

لھذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اس بنیادی مسئلہ (یعنی حضرت علیؑ کی جانشینی) کیلئے بار بار تاکید کی اور اسلام کی اس حیات بخش حقیقت کے اظہار کیلئے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا اور کسی بھی موقعہ پر اس مسئلہ سے غفلت نہیں برتی۔

حدیث ثقلین کا مفہوم

چند قابل توجہ باتیں:

۱) قرآن اور عترت کا ''دو خلیفہ'' یا ''دو گرانقدر چیزوں'' کے طور پر تعارف اس بات کی روشن دلیل ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان دونوں کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑیں اس بات کی اہمیت اس وقت زیادہ ہوجاتی ہے جب بہت سی روایات میں ہم یہ شرط بھی ہمراہ پڑھتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: اگر ان دونوں کا دامن نہ چھوڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے، تو یہ حقیقت اس تاکید کیساتھ روشن ہوجاتی ہے۔

۲) اس حدیث میں قرآن کو عترت کیساتھ اور عترت کو قرآن کیساتھ ساتھ قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح قرآن میں تحریف نہ ہوگی اور وہ ہر طرح سے پاک اور محفوظ رہے گا اسی طرح عترت (خاندان پیغمبرؐ) بھی عصمت کے حامل رہیں گے۔

۳) بعض روایات میں پیغمبرؐ نے صراحت سے فرمایا ہے کہ روز قیامت میں تم لوگوں سے ان دونوں اہم یادگاروں کے ساتھ کیے گئے تمھارے برتاؤ کے بارے میں سوال کروں گا تاکہ دیکھوں کہ تمھارا ان کے ساتھ سلوک کیسا تھا؟

۴) بلاشک و تردید ہم ''عترت و اہل بیت'' کی تفسیر جس انداز میں بھی کریں حضرت علیؑ اسکے سب سے زیادہ نمایاں فرد ہیں اور متعدد روایات کے مطابق حضرت علیؑ ہرگز قرآن سے جدا نہیں ہوں گے اور نہ ہی قرآن آپ سے جدا ہوگا۔

علاوہ ازیں ہم متعدد روایات میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ آیت ''مباہلہ'' کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو پکارا اور فرمایا: یہ میرے اہل بیت ہیں(۱)

۵) اس دنیا کی چار دیواری میں محصور ہونے کی وجہ سے قیامت کے اکثر مسائل ہمارے لئے پوری طرح واضح نہیں ہیں لیکن پھر بھی روایات کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ ''حوض کوثر'' سے مراد بہشت میں مختلف نعمتوں سے پر ایک نہر ہے جو خالص مومنین اور خاص طور پر پیغمبر اسلامؐ، انکے اہل بیتؑ اور انکے مکتب کے پیروکاروں کیلئے مخصوص ہے۔

ہماری اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ امت کیلئے پناہ گاہ اور مسلمانوں کے رہبر پیغمبر اسلامؐ کے بعد حضرت علیؑ اور انکے بعد گیارہ امام انکے اہل بیت میں سے ہیں۔

حدیث سفینہ نوح

اہل سنت اور اہل تشیع کی کتابوں میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول جاذب تعبیرات میں سے ایک وہ تعبیر ہے جو مشہور حدیث ''حدیث سفینہ نوح'' میں آئی ہے۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ: پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا!

---

۱) مشکوۃ المصابیح صفحہ ۵۶۸ (چاپ دہلی) ریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۸ (نقل از مسلم و ترمذی)

"الا ان مثل اهل بیتی فیکم مثل سفینة نوح،
من رکبها نجی و من تخلف عنها غرق"

"میرے خاندان اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی طرح ہے جو شخص اس میں سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس سے جدا ہوا وہ ہلاک ہو گیا"(۱)

یہ حدیث جو کہ مشہور احادیث میں سے ہے ہمیں بتاتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی وفات کے بعد حضرت علیؑ اور خاندان پیغمبرؐ کی پیروی اور اطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے۔

اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اس عظیم وعالمگیر طوفان کے وقت صرف کشتی نوح ہی نجات کا ذریعہ تھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ امت مسلمہ کے لئے پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد جو بھی طوفان آئے ان میں راہ نجات صرف ولایت اہل بیتؑ سے تمسک ہی تھا اور رہے گا۔

---

۱) مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۵۱

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) حدیث ثقلین کا مفہوم اور اس میں مذکور اہل بیت کے امتیازات کو بیان کریں؟

۲) حدیث ثقلین کے راوی حضرات کون ہیں؟

۳) "ثقلین" سے کیا مراد ہے؟ کیا احادیث میں لفظ "ثقلین" کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ بھی وارد ہوا ہے وضاحت کریں؟

۴) پیغمبر اسلامؐ نے حدیث ثقلین کو کن مواقع پر ارشاد فرمایا؟

۵) حدیث سفینہ کی سند اور اسکا مفہوم بیان کریں؟

نواں سبق

بارہ امام

بارہ اماموں کے بارے میں روایات

حضرت امیر المومنین علیؑ کی بلافصل خلافت اور امامت کو ثابت کرنے کے بعد اب ہم باقی (گیارہ) آئمہ معصومینؑ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مختصر گفتگو یہ ہے کہ:

آج ہمارے سامنے اہل سنت اور اہل تشیع کی کتابوں مین بیان کردہ ایسی متعدد احادیث موجود ہیں جو پیغمبرؐ کے بعد بارہ خلفاء اور ائمہؑ کی خلافت و امامت کے بارے میں ہماری مکمل راہنمائی کرتی ہیں۔

یہ احادیث اہل سنت کی انتہائی مشہور اور اہم کتب احادیث مثلاً صحیح بخاری، صحیح ترمذی، صحیح مسلم، صحیح ابی داؤد، اور مسند احمد، وغیرہ میں نقل کی گئی ہیں۔

''منتخب الاثر'' نامی کتاب میں اس موضوع پر دوسوا کہتر (۲۷۱) احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں سے اکثر برادران اہل سنت کی کتابوں سے جبکہ باقی علماء، اہل تشیع کی کتابوں سے نقل کی گئی ہیں۔

مثلاً اہل سنت کی سب سے زیادہ مشہور کتاب صحیح بخاری میں ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ:

جابر بن سمرۃ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ سے سنا تھا وہ فرمارہے تھے:

"یکون اثنا عشر امیراً ۔ فقال کلمۃ لم اسمعھا ۔ فقال ابی انہ قال کلھم من قریش"

میرے بعد بارہ ''امیر'' ہونگے ۔ اس کے بعد ایک جملہ ارشاد فرمایا جو میں نہ سن سکا۔ لیکن میرے باپ نے کہا کہ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا یہ سب قریش کے خاندان سے ہونگے (۱)

اس حدیث کو ''صحیح مسلم'' میں بھی کچھ الفاظ کے اضافہ کیساتھ نقل کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ! ''جابر بن سمرۃ'' کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ سے سنا کہ انہوں نے فرمایا!

"لا یزال الاسلام عزیزاً الی اثنا عشر خلیفۃ ثم قال کلمۃ لم افھمھا فقلت لابی ما قال فقال کلھم من قریش"

اسلام ہمیشہ عزیز رہے گا یہانتک کہ میرے بارہ خلیفہ ہونگے۔ اس کے بعد ایک جملہ ارشاد فرمایا جسے میں سمجھ نہ سکا اور میں نے اپنے باپ سے اس جملے کی وضاحت پوچھی تو انہوں نے کہا، پیغمبرؐ نے فرمایا کہ یہ سب (خلفاء و امام) قبیلہ قریش سے ہونگے (۲)

---

۱) صحیح بخاری ج/۹ کتاب الاحکام صفحہ ۱۰۰

۲) صحیح مسلم، کتاب الامارہ باب الناس تبع قریش۔

اہل سنت کی کتاب ''مسند احمد'' میں مشہور صحابی ''عبداللہ بن مسعود'' سے ایک روایت یوں نقل کی گئی ہے کہ پیغمبرؐ سے ان کے خلفاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اثنا عشر کعدۃ نقباء بنی اسرائیل'' میرے خلفاء کی تعداد بنی اسرائیل کے نقباء اور رؤساء قوم کی طرح بارہ (۱۲) ہوگی (۱)

مذکورہ احادیث کا مفہوم

تمام مذکورہ احادیث کہ جن میں سے بعض میں اسلام کی عزت کا دارومدار بارہ آئمہ کے ذریعے قرار دیا گیا ہے اور دیگر احادیث میں دینِ اسلام کی قیامت تک بقاوحیات بارہ خلفاء کی مرہون منت قرار دی گئی ہے جو سب قریش سے ہونگے اور بعض احادیث میں ان تمام بارہ آئمہ کو ''خاندان بنی ہاشم'' سے قرار دیا گیا ہے۔ ان تمام احادیث کو انکے حقیقی معانی کیساتھ اگر کسی مذہب نے سمجھا ہے اور اسکو اختیار کیا ہے تو وہ مکتب و مذہب ''اہل تشیع کا مذہب'' ہے، جبکہ دیگر مذہب کے علماء ان احادیث کی صحیح توضیح کے سلسلہ میں پریشانی کا شکار ہیں کہ! کیا خلفاء (اور آئمہ) سے مراد پہلے چار خلفاء اور پھر بنی امیہ و بنی عباس کے خلفاء ہیں؟

(یہ قطعاً درست نہیں ہے کیونکہ) ہم جانتے ہیں کہ نہ تو پہلے خلفاء کی تعداد بارہ تھی اور نہ ہی خلفاء بنی امیہ یا خلفاء بنی عباس یا دونوں قسم کے خلفاء کو جمع کرنے سے احادیث میں مذکور تعداد پوری ہوسکتی ہے۔

---

۱) مسند احمد ج/ ۱ صفحہ ۳۹۸

اس کے علاوہ بنی امیہ میں ''یزید'' جیسے افراد جبکہ خلفاء بنی عباس میں ''منصور دوانیقی'' اور ''ہارون الرشید'' جیسے افراد بھی خلیفہ بنے تھے کہ جنکے ظلم وستم، استکبار و تباہ کاریوں اور جنایات میں شک و تردید نہیں ہے، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان کا شمار خلفاء پیغمبرؐ اور اسلام کی عزت و سربلندی کے لئے کام کرنے والی قابل فخر شخصیات میں کیا جاسکے، مقام وولایت وخلافت کا معیار ہم جس حد تک بھی نیچے لے آئیں پھر بھی یہ اور انکی قسم کے دیگر افراد اس الٰہی عہدہ کیلئے قطعاً غیر موزوں ہیں۔

لھذا اس تمام بحث کے بعد خلفاء کا عدد (یعنی بارہ) صرف اہل تشیع کے بارہ ائمہ سے ہی مکمل ہوسکتا ہے۔

یہ بحث ہم اہل سنت کے ایک معروف و بزرگ عالم کی زبان سے ہی پیش کرتے ہیں۔

''سلمان بن ابراہیم قندوزی حنفی'' اپنی کتاب ''ینابیع المودۃ'' میں فرماتے ہیں:

بعض محققین کہتے ہیں کہ: وہ احادیث جو کہ رسول اللہ کے بعد خلفاء کی تعداد ''بارہ'' بتاتی ہیں، بہت ہی مشہور ہیں اور بہت سے مختلف طریقوں سے ہم تک پہنچی ہیں، گزرتے زمان کے ساتھ جو ہم نے تحقیق کی ہے اس سے صرف ایک بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ کی اس حدیث سے مراد انکے اہل بیت وعترت میں سے بارہ جانشین ہیں۔ لھذا یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ ان احادیث سے مراد ''خلفاء راشدین (پہلے چار خلفاء) ہوں'' کیونکہ وہ ''چار'' تھے ان احادیث سے مراد ''خلفاء بنی امیہ'' بھی نہیں ہے کیونکہ ان کی تعداد بارہ سے زیادہ تھی اور ''عمر بن عبدالعزیز'' کے علاوہ وہ سب ظالم وستمگر تھے اور تیسری بات یہ کہ وہ بنی ہاشم میں سے نہیں تھے اور پیغمبرؐ فرما چکے تھے کہ وہ (بارہ ائمہ) بنی ہاشم سے ہونگے جیسا کہ ''عبدالملک بن عمر'' نے ''جابر بن سمرہ'' سے نقل کیا ہے، اور پیغمبر اسلامؐ کا اس وقت ...

بارہ خلفاء کس خاندان سے ہونگے'' کے جواب میں آہستہ آواز میں جواب فرمانا بتاتا ہے کہ بنی ہاشم کی خلافت پر دیگر قبائل کے اکثر افراد خوش نہ تھے، اسی طرح یہ احادیث ''بنی عباس'' پر بھی منطبق نہیں ہوسکتیں کیونکہ نا صرف انکی تعداد بارہ سے زیادہ تھی بلکہ انہوں نے آیت مودت: قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربی (سورہ شوری آیت ۲۳) پر عمل نہیں کیا اور ''حدیث کسا'' کو پس پشت ڈال دیا۔

ان وجوہات کی بنیاد پر یہ حدیث صرف پیغمبرؐ کے اہل بیت وعترت میں سے منتخب بارہ ائمہؑ پر ہی صد در صد منطبق ہوسکتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

کیونکہ یہ تمام بارہ ائمہ علم و دانش کے اعتبار سے سب سے بڑے عالم ہیں زہد و تقویٰ کے اعتبار سے سب سے بڑے زاہد و پارسا ہیں حسب ونسب کے اعتبار سے سب سے بلند رتبہ پر فائز ہیں، اور ان سب نے تمام علوم وفنون کو اپنے ''جد رسول اللہ'' سے وراثت میں حاصل کیا ہے۔

حدیث ثقلین اور دیگر احادیث جو کہ پیغمبر اسلامؐ سے ہم تک پہنچی ہیں وہ تمام ہماری اس بات کی تائید کرتی ہیں(۱)

ایک دلچسپ بات کہ جو حجاز و مکہ کے سفر کے دوران بعض علماء حجاز سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے پیش آئی ''وہ بارہ آئمہ سے متعلق وارد احادیث کی ایک اور تفسیر پیش کرتے ہیں جس کو سننے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے مسئلہ میں انہوں نے کتنی سخت اور

۱) ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۶۔

ناقابل حل مشکل کا سامنا کیا ہے اور کر رہے ہیں، انکا کہنا تھا کہ ان احادیث میں جو بارہ خلفاء کا کہا گیا ہے ان میں سے چار خلفاء وہ ہیں کہ جو اسلام کے ابتدائی دور میں گزر چکے ہیں جبکہ دیگر آٹھ خلفاء آئندہ ظاہر ہونگے!

اسطرح سے پیغمبر کی حدیث میں بیان کردہ بارہ خلفاء کی طرف وہ (دانستہ) توجہ نہیں کرتے، ہم کہتے ہیں کہ کیا ہم بارہ ائمہ کے بارے میں احادیث کہ جو صد در صد اہل تشیع کے بارہ ائمہ پر منطبق ہوتی ہیں انکو چھوڑ کر ان افراد کی گفتگو سنیں اور ان ابحاث میں چلے جائیں کہ جنکی مشکلات ہم پر واضح ہیں؟

آئمہ کے ناموں کیساتھ انکا انتخاب

اس مقام پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام کی بعض روایات جو کہ اہل سنت کے ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں صراحت کے ساتھ بارہ آئمہ کے نام بیان ہوئے ہیں اور انکی خصوصیات کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے!

اہل سنت کے مشہور عالم ''شیخ سلمان قندوزی'' اپنی کتاب ''ینابیع المودہ'' میں رقمطراز ہیں:

''نعثل'' نام کا ایک یہودی پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے چند سوالات کے دوران اس نے پیغمبرؐ سے ان کے اوصیاء اور خلفاء کے متعلق سوال کیا تو پیغمبرؐ نے اپنے جانشینوں کا تعارف ان الفاظ میں کروایا۔

"ان وصی علی بن ابی طالب و بعده
سبطای الحسن والحسین

من صلب الحسين قال يا محمد فسمهم
لی: قالؐ اذا مضی الحسین فابنه علی،
فاذا مضی علی فابنه محمد، فاذا مضی
محمد فابنه جعفر، فاذا مضی جعفر فابنه
موسی، فاذا مضی موسی فابنه علی،
فاذا مضی علی فابنه محمد، فاذا مضی
محمد فابنه علی، فاذا مضی علی فابنه
الحسن، فاذا مضی الحسن فابنه الحجة
محمد المهدی (ع) الی فهؤلاء اثنا عشر"

میرے وصی علی بن ابی طالب ہیں انکے بعد میرے دو فرزند (نواسے) حسنؑ اور حسینؑ ہونگے اور حسینؑ کے بعد نو امام انکی نسل سے ہونگے، یہودی نے عرض کیا کہ ان نو آئمہ کے نام بھی بیان فرمادیں آپؐ نے فرمایا: جب حسینؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند علی (زین العابدینؑ) ہونگے اور جب علیؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند محمد (الباقرؑ) ہونگے اور جب محمدؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند جعفر (الصادقؑ) ہونگے اور جب جعفرؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند موسیٰ (الکاظمؑ) ہونگے اور جب موسیٰؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند علی الرضاؑ اور جب علیؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند محمد (الجوادؑ) ہونگے اور جب محمدؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند علی (الہادیؑ) ہونگے اور جب علیؑ دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند حسن (العسکریؑ) جانشین ہونگے اور جب حسنؑ

دنیا سے رخصت ہونگے تو انکے فرزند حجت خدا محمد المہدی عج اللہ فرجہ جانشین ہونگے اور اس طرح سے بارہ ائمہ میرے بعد ہونگے (۱)

نیز اسی کتاب "ینابیع المودۃ" میں کتاب "مناقب" سے بھی ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں بارہ ائمہ کے "اسماء مبارک" انکے "القاب" سمیت بیان کئے گئے ہیں اور حضرت امام (مہدی) کے بارے میں ان کی غیبت اور ان کے انقلاب اور ان کے زمین کو عدل وانصاف سے پر کردینے اور ظلم وستم کو اسکی جڑ سے ختم کردینے کی بشارت دی گئی ہے (۲) البتہ اہل تشیع کے ذرائع میں اس حوالے سے بہت سی احادیث ہیں کہ جو تواتر کی حد سے بھی بڑھ گئی ہیں (غور کریں)

جو شخص مرجائے اور اپنے زمانے کے امام کی معرفت حاصل نہ کرے......

دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں پیغمبر اسلام کی احادیث میں سے یہ حدیث بھی موجود ہے:

"من مات بغیر امام مات میتة جاهلیة"

جو شخص (اپنے زمانے کے) امام کے (یعنی امام کی معرفت کے) بغیر مرگیا
اس کی موت جاہلیت کی موت ہے (۳)

یہی حدیث اہل تشیع کی کتابوں میں ان الفاظ سے ذکر کی گئی ہے۔

---

۱) ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۱۔
۲) ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۲۔
۳) المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبوی جلد ۶ صفحہ ۳۰۲۔

"من مات و لم یعرف امامه مات میتة جاهلیة"

جو شخص مرگیا اور اس نے اپنے زمانے کے امام کی معرفت حاصل نہیں کی تو اسکی موت جاہلیت کی موت ہے(۱)

یہ حدیث واضح طور پر ہمیں اس بات سے آگاہ کرتی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے اور لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں اور اگر انہوں نے اپنے زمانے کے معصوم امام کی معرفت حاصل نہ کی تو یہ بات اتنی نقصان دہ ہے کہ اسے کفر اور جاہلیت کی سرحد تک پہنچادے گی۔

کیا اس حدیث میں امام و پیشوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکومتوں کے سربراہ ہوں جیسے چنگیز خان، ہارون اور ان جیسے دیگر لوگ؟ بلا شک وشبہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ اکثر حکمران غیر صالح، ظالم و ستمگر اور کبھی شرق وغرب سے وابستہ اور اغیار کی سیاست پر عمل کرنے والے تھے اور ہیں لھذا بغیر کسی شک کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان اشخاص (حکمران) کی معرفت اور ان سربراہان کی امامت پر اعتقاد لوگوں کو جہنم میں بھیج دیتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ: ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے لھذا لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسکو تلاش کرکے اسکی معرفت حاصل کریں اور اسکی امامت کو تسلیم کریں۔

اسکے علاوہ ہر امام معصومؑ کی امامت نا صرف قرآنی نصوص سے ثابت ہے بلکہ ان احادیث اور روایات سے بھی ثابت ہے جو ہر سابق امام سے آنے والے امام کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں نیز ائمہ کے معجزات بھی اس بات کو ثابت کرتے ہیں۔

---

۱) بحارالانوار ج/۶ (چاپ قدیم) صفحہ ۱۶

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) بارہ اماموں (ائمہ اثنا عشر) کے بارے میں روایات کن کتابوں میں نقل کی گئی ہیں؟

۲) ان احادیث کا مفہوم بیان کریں؟

۳) ان احادیث و روایات کے بارے میں کی گئی غیر مناسب توجیہات کونسی ہیں بیان کریں؟

۴) کیا اہل سنت کی ذکر کردہ احادیث میں بھی بارہ اماموں کا نام بیان ہوا ہے؟

۵) بارہ اماموں (ائمہ اثنا عشر) کے اثبات کے اور کونسے ذرائع ہیں بیان کریں؟

دسواں سبق

حضرت امام مہدی (ع) بارھویں امام اور دنیا کے مصلح اعظم

۱) تاریک شب کا اختتام

جب بھی ہم آج کے حالات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر طرف ظلم و زیادتی، قتل و غارت و فساد، جنگیں، خون ریزیاں، مختلف ممالک کے درمیان کشمکش اور روز بروز زیادہ ہونے والی اخلاقی خرابیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں اور پھر ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب مسائل اسی طرح جاری رہیں گے؟ اور کیا یہ ظلم و فساد اس قدر بڑھ جائے گا کہ پھر انسانی معاشرہ ایک دائمی جنگ میں پھنس کر تباہ و برباد ہو جائے گا؟ اور کیا صحیح اسلامی عقائد سے انحراف اور اخلاقی برائیاں انسانی معاشرے کو اسی طرح متعفن کرتی رہیں گی؟ کیا انسانیت کی نجات اور اصلاح کے لیے امید کی کوئی راہ باقی ہے؟

اس اہم سوال کے دو جواب دیے جاسکتے ہیں:

اول: وہ جواب ہے جو بدبین اور مادہ پرست دیتے ہیں کہ دنیا کا مستقبل تاریک ہے اور ہر وقت خطرے کا ایک امکان موجود رہتا ہے۔

دوم: دوسرا جواب آسمانی مذاہب کو ماننے والوں کی طرف سے ہے، مسلمان اور ان میں سے بالخصوص اہل تشیع اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس تاریک اور بھیانک شب کے پیچھے امید کی ایک صبح موجود ہے، یہ سیاہ و تاریک ابر، موت کے طوفان اور ویرانی پھیلا دینے والے سیلاب ایک دن ختم ہونے والے ہیں اور پھر اس کے بعد ایک روشن آسمان اور چمکتا ہوا سورج اور امن و امان کی فضا انسانی معاشرے کے سامنے آنے والی ہے۔

مشکلات کے یہ خوفناک بھنور ختم ہو جائیں گے اور افق پر ایک نجات کا ساحل ہماری نظروں کے بالکل قریب ہوگا۔

دنیا ایک عظیم مصلح کے انتظار میں ہے جو تمام دنیا کو ایک انقلاب کے ذریعے عدل و حق سے بھر دے گا۔

البتہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اس عظیم مصلح کو الگ الگ ناموں سے جانتے ہیں جیسے ایک عرب شاعر کے بقول:

عبارا تنا شتی و حسنک واحد

و کل الی ذاک الجمال یشیر

ہماری تعبیریں مختلف ہیں مگر آپ کا حسن و زیبائی، ایک حقیقت ہے اور ہمارے تمام اقوال اسی حسن و زیبائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فطرت اور مصلح اعظم کا ظہور

باطنی الہامات کہ جنگی امواج بعض اوقات انسان کے عقلی فیصلوں سے بھی زیادہ

طاقتور ہوتی ہیں وہ نا صرف خدا کی معرفت کے حصول کیلئے ہماری راہنمائی کرتی ہیں بلکہ وہ تمام مذھبی اعتقادات کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہیں، وہ باطنی الہامات اس مسئلہ (مصلح اعظم کا ظہور) کے بارے میں بھی ہماری راہنما ہیں۔

باطنی الہامات کی علامات:

پہلی علامت: عالمگیر عدالت وانصاف سے عشق ومحبت ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود اور بغیر کسی استثناء کے صلح وعدالت سے عشق رکھتے ہیں اور ہم سب اسی کے لیے آواز بلند کرتے ہیں اور اسکے لیے کوشش کرتے ہیں اور عالمگیر صلح وعدالت کے اپنے تمام تر وجود کے ساتھ متمنی ہیں۔

مصلح اعظم کے ظہور کے فطری ہونے کی اس سے بہتر دلیل ممکن نہیں ہے کیونکہ ہر جگہ اور ہر ایک کی ایک جیسی تمنا اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے (غور کیجئے)

ہر فطری اور حقیقی عشق، معشوق کے وجود اور اس کی جاذبیت اور کشش کی حکایت کرتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا نے انسان کے دل میں اس تڑپ کو تو پیدا کیا ہو لیکن وہ چشمہ کہ جس سے وہ سیراب ہو سکے اسکا وجود ہی نہ ہو؟

اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ انسان کا ضمیر اور عدل وانصاف کے حصول کیلئے اسکی فطری خواہش باآواز بلند کہہ رہے ہیں کہ آخر کار تمام دنیا میں صلح وانصاف پھیل کر رہے گا اور ظلم وستم کی بساط الٹ جائے گی اور تمام انسانیت ایک پرچم تلے ایک ملک کی حیثیت سے مفاہمت اور پاکیزگی پر مبنی زندگی گزارے گی۔

دوسری علامت: دنیا کے تقریبا تمام مذاہب میں ایک مصلح اعظم کے انتظار کا نظریہ و عقیدہ کم وبیش پایا جاتا ہے، اور تمام مذاہب میں اس موضوع پر تفصیلی اور دلچسپ ابحاث موجود ہیں، ایک عظیم نجات دہندہ کے ظہور پر ایمان اور وجود بشریت کے زخموں پر مرہم رکھنے جیسے مسائل صرف مسلمانوں کے درمیان ہی زیر بحث نہیں ہیں بلکہ موجودہ دلیلیں اور ثبوت اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ اعتقاد ایسا عام اور قدیم ہے جو مشرق ومغرب کی تمام اقوام اور مذاہب میں موجود تھا لیکن اسلام چونکہ ایک مکمل مذہب ہے لھذا اس میں مذکورہ مسئلہ زیادہ تاکید کیساتھ موجود ہے۔

زرتشتیوں کی مشہور کتابوں میں سے ایک کتاب "زند" میں ایزدان اور اہریمنان میں ہمیشہ رہنے والی جنگ کے بیان کے بعد لکھا ہے: جب ایزدان کی طرف سے عظیم کامیابی ہوگی اور اہریمنان کو نابود کر دیا جائے گا ...... "یہ کائنات اپنی حقیقی سعادت کو حاصل کرلے گی اور بنی آدم خوش قسمتی کے تخت پر بیٹھ جائیں گے"۔

زردشتیوں کی کتاب "جاماسب نامہ" میں زردشت سے یوں نقل ہوا ہے کہ: تازیوں کی سرزمین سے ایک شخص ظاہر ہوگا...... ایک بڑے سے سر، بڑی پنڈلیوں اور بڑے جسم والا انسان اپنے جد کے دین پر ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے گا اور زمین کو عدل وانصاف سے پر کر دے گا۔

ہندوؤں کی کتاب "وشن جوگ" میں اسکا ذکر کچھ اس طرح بیان ہوا ہے: بالآخر دنیا ایک ایسے شخص کی طرف پلٹے گی جو خدا کو دوست رکھتا ہوگا اور وہ خدا کے خاص بندوں میں سے ایک بندہ ہوگا۔

ہندوؤں کی ایک اور کتاب "باسک" میں ہے کہ: دنیا کا اختتام ایک

ہوگا۔ وہ فرشتوں، پریوں اور انسانوں کا رہبر ہوگا حق وصداقت اسکے ہمراہ ہونگے اور وہ سمندروں، زمینوں، پہاڑوں میں موجود تمام پوشیدہ چیزوں کو حاصل کرے گا؟ زمین سے لیکر آسمان تک جو کچھ بھی ہوگا اس کی وہ خبریں دیگا اور اس سے زیادہ بڑھ کر کوئی شخص دنیا میں نہیں آئے گا!

قدیم زمانے کی (تورات اور اس سے متعلق مکتوبات) کتابوں میں سے ایک کتاب ''مزامیر داؤد'' میں ہم یہ پڑھتے ہیں: ''شرارتی لوگ ختم ہو جائیں گے لیکن خدا پر توکل کرنے والے بندے زمین کے وارث بن جائیں گے'' اور اسی کتاب کے اسی حصے میں لکھا ہے: ''سچے لوگ زمین کے وارث ہونگے اور ہمیشہ اس پر سکونت کریں گے''۔

اسی بیان کے مشابہ توریت کی کتابوں میں سے ''اشعیای نبی'' کی کتاب میں بھی ذکر ہوا ہے ''انجیل متی'' کی فصل نمبر ۲۴ میں ہے: جیسے مشرق میں بجلی چمک کر مغرب تک ظاہر ہو جاتی ہے اسی طرح ایک انسان بھی ظاہر ہوگا.....''

''لوقا کی انجیل'' کی بارہویں (۱۲) فصل میں ہے: اپنی کمریں تیار اور اپنے چراغوں کی روشنی کو تیز رکھو اور ایک ایسے انسان کی طرح رہو جو اپنے مالک کا منتظر ہوتا ہے کہ جیسے ہی مالک آکر دروازہ کھٹکھٹائے تو وہ دروازے کو بے دریغ کھول دے!

کتاب ''علائم الظہور'' میں ہے: اہل چین کی پرانی کتابوں، ہندوستانیوں کے عقائد، اسکینڈ ینیوین ممالک کے باشندوں، قدیم مصریوں اور میکسیکو کے لوگوں اور ان جیسی دیگر اقوام میں بھی ''ایک مصلح اعظم'' کے ظہور کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔

عقلی دلائل:

الف: نظام آفرینش ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ دنیائے انسانیت کو بالآخر انصاف پر مبنی ایک قانون کو ماننا پڑے گا اور ایک عادلانہ نظام و پایدار مصلح کے آگے

اپنا سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

اس بات کی وضاحت یوں ہے کہ! ہمارے علم کے مطابق نظام کائنات بہت سے نظاموں کا ایک مجموعہ ہے اور اس تمام دنیا میں منظم قوانین کا وجود اس نظام ہستی کی وحدت و ہم آہنگی کی دلیل ہے۔

نظم وضبط، قوانین اور منصوبہ بندی اور حساب وکتاب کا مسئلہ اس دنیا کے سب سے زیادہ حقیقی اور بنیادی مسائل میں شمار ہوتا ہے۔

بڑے بڑے نظاموں سے لیکر ایک ایٹم کے ذرے تک (کہ لاکھوں ایٹم سوئی کی نوک پر آسکتے ہیں) تمام اشیاء ایک خاص اور صحیح طور پر نپے تلے نظام کے تابع ہیں۔

ہمارے جسم کے مختلف اعضاء ''ایک انوکھے چھوٹے سے سیل (cell) سے لیکر دماغ و اعصاب کے پیچیدہ جال اور قلب وجگر کے کام کرنے تک'' یہ سب کچھ اسطرح منظم ہیں کہ بعض ماہرین کے بقول: ان میں سے ہر ایک ''ایک انتہائی صحیح گھڑی کی مانند'' کام کرتا ہے اور انکے مقابلہ میں انتہائی منظم ماشین کمپیوٹر بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

کیا اتنی منظم کائنات میں انسان جو اس ''کل'' کائنات کا ایک ''جز'' ہے ایک بے رنگ اور غیر منظم جزء کی مانند جنگ وجدال، خونریزی اور ظلم وستم کے سائے تلے زندگی گزار سکتا ہے؟

کیا ناانصافیاں، اخلاقی اور اجتماعی برائیاں جو کہ بے نظمی کی علامتیں ہیں اسی طرح ہمیشہ انسانی معاشرے پر حاکم رہ سکتی ہیں؟

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ: نظام کائنات کا دقیق مشاہدہ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ بالآخر انسانی معاشرہ بھی نظم اور عدل وانصاف کی طرف جھکے گا [illegible]

کے صحیح راستے کی طرف واپس آجائے گا!

ب: معاشروں کی راہ کمال پر ارتقائی حرکت انسانیت کے روشن مستقبل کی دلیل ہے کیونکہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ انسانی معاشرے نے جس دن سے اپنے آپ کو پہچانا ہے اس دن سے وہ کسی جگہ اور کسی مرحلے پر رکا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ ترقی کی طرف حرکت کرتا رہا ہے۔

مادی اعتبار سے مکان، لباس، غذا اور آمد و رفت کے ذرائع وغیرہ ایک زمانے میں بالکل معمولی شکل میں تھے لیکن آج یہ سب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ عقل حیران اور آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور ارتقاء کا یہ سفر یقیناً جاری رہے گا۔

علم و دانش اور تمدن بھی ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن ہے اور ان تمام شعبہ جات میں ہر روز نئی معلومات، تحقیقیات اور نئے مطالب کا اضافہ ہو رہا ہے۔

اس ''ارتقائی قانون'' میں آخر کار باطنی، اخلاقی اور اجتماعی پہلو بھی شامل ہوجائیں گے جو انسانیت کو ایک منصفانہ قانون اور ایک پائیدار صلح و عدالت اور اخلاقی و باطنی فضائل کی طرف لے جاتے ہیں، اگر آج اخلاقی مفاسد میں اضافہ ہو رہا ہے تو بالآخر یہ چیز بذات خود ایک حقیقی و ارتقائی انقلاب کیلئے زمین ہموار کر رہی ہے۔

ہم ہرگز یہ نہیں کہہ رہے کہ ''فساد'' کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جس وقت فساد ایک حد سے گزر جائے گا تو اسکے ردِعمل میں ایک اخلاقی انقلاب رونما ہوگا۔

جب انسان مشکلات میں بے بس اور گناہوں کے بدترین نتائج کا شکار ہونگے اور انکی عقلیں بیکار ہوجائیں گی اور ان کی جانیں لب پر آجائیں گی تو اس وقت وہ کم از کم ایک

ایسے قانون کو ماننے پر آمادہ ہوجائیں گے جو ایک الٰہی رہبر کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔

قرآن اور حضرت مہدی (عج) کا ظہور

عظیم آسمانی کتاب قرآن مجید کی متعدد آیات اس عظیم ظہور کی خوش خبری دے رہی ہے (ہم صرف ایک آیت پیش کریں گے)

سورہ نور کی آیت ۵۵ میں ارشاد خداوندی ہے:

"وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم......"

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلے والوں کو جانشین بنایا۔

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر زمین پر جابر حکمرانوں اور ستمگر فرمانرواؤں کی حکومت ختم ہوجائے گی اور ساری زمین پر صالح مومنین حکومت کریں گے

اسی آیت کے آخر میں مزید تین وعدے بھی کئے گئے ہیں:

۱) حقیقی دین کا قیام اور لوگوں کے قلوب میں حکومت الٰہیہ کا نفاذ:

"لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم"

۲) خوف و بدامنی کا امن و امان میں تبدیل ہونا:

"و لیبدلنهم من بعد خوفهم امناً"

۳) ساری زمین سے شرک کا خاتمہ:

"یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً"

حضرت امام علی بن الحسین زین العابدین مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ھم واللہ شیعتنا یفعل اللہ ذلک بھم علی یدی رجل منا و ھو مھدی ھذہ الامۃ"

خدا کی قسم یہ وہی ہمارے مذہب کے پیروکار ہیں خدا ہمارے خاندان کے ایک شخص کے ذریعے سے یہ (حکومت الٰہیہ) قائم کرے گا اور وہی شخص اس امت کا مہدی ہوگا(۱)

احادیث میں حضرت مہدی (عج) کا تذکرہ

اہل تشیع اور اہل تسنن کی کتب احادیث میں اس موضوع کے بارے میں "کہ خاندان پیغمبرؐ سے مہدی نامی ایک فرد کے ذریعہ سے صلح وعدالت پر مبنی ایک عالمی حکومت قائم ہوگی" بہت سی احادیث ذکر کی گئی ہیں یہاںتک کہ یہ احادیث حد تواتر سے بھی بڑھ گئی ہیں جبکہ کتب اہل تشیع میں بھی ایسی متواتر احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (مہدی عج) بارہویں امام، جانشین پیغمبرؐ امام حسینؑ کے نویں بیٹے اور امام حسن عسکریؑ کے فرزند ہیں۔

---

۱) تفسیر مجمع البیان سورہ نور آیت ۵۵ کی تفسیر میں یہ حدیث موجود ہے۔

اہل سنت کی کتب احادیث میں ظہور مہدی (عج) کے بارے میں احادیث کے تواتر کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ اہل سنت کے دانشور حضرات نے اپنی کتب میں انہیں واضح طور پر نقل کیا ہے، یہاں تک کہ حجاز کے سب سے بڑے دینی مرکز "رابطہ عالم اسلامی" سے شائع ہونے والے رسالے میں لکھا گیا ہے: "وہ (مہدی عج) بارہ خلفاء راشدین میں آخری خلیفہ ہیں جنکے بارے میں پیغمبرؐ نے صحیح ترین احادیث میں خبر دی ہے اور مہدی (عج) کے متعلق پیغمبرؐ کے بہت سے اصحاب نے احادیث نقل کی ہیں"

اس رسالے میں ان بیس صحابہ کے ناموں کا بھی ذکر ہے کہ جنہوں نے حضرت مہدی عج کے بارے میں پیغمبرؐ سے احادیث نقل فرمائی ہیں اسکے بعد لکھتے ہیں: اس کے علاوہ بھی بہت سے مختلف گروہوں نے احادیث نقل کی ہیں...... بعض اہل سنت علماء نے حضرت مہدی عج کے بارے میں مستقل کتابیں تحریر کی ہیں ان میں سے ابونعیم اصفہانی، ابن حجر ہیثمی، شوکانی، ادریس مغربی اور ابن العباس ابن عبدالمومن قابل ذکر ہیں۔ مزید لکھتے ہیں: قدیم وعصر جدید کے بڑے بڑے علماء اہل سنت کے ایک گروہ نے حضرت مہدی (عج) کے بارے میں احادیث کے متواتر ہونے کی توثیق کی ہے مزید لکھتے ہیں: بہت سے حفاظ اور محدثین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مہدی کے بارے میں احادیث صحیح اور حسن ہیں اور وہ سب ہی قطعی طور پر متواتر بھی ہیں اور قیام مہدی (عج) کے بارے میں اعتقاد رکھنا واجب ہے اور یہ عقیدہ قیام مہدی (عج) اہل سنت والجماعت کے عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے۔ اور جاہل اور ایسے لوگ جنہیں ہر چیز میں بدعت نظر آتی ہے انکے علاوہ کوئی شخص اس عقیدہ کا منکر نہیں ہوسکتا۔

اہل تشیع کی احادیث

اس موضوع پر مختلف راویوں نے پیغمبرؐ اور ائمہ ہدیٰ سے سینکڑوں احادیث نقل کی ہیں کہ وہ حد تواتر سے بھی آگے ہیں اور اہل تشیع کے نزدیک یہ عقیدہ ضروریات دین میں سے ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اہل تشیع کیساتھ زندگی گزارے اور ظہور مہدی (عج) کے بارے میں ان کے عقائد، حضرت مہدی (عج) کی خصوصیات، ظہور کی نشانیاں ان کا طرز حکومت اور انکے مختلف منصوبوں کے بارے میں وہ نہ جانتا ہو۔

اہل تشیع کے بڑے بڑے علما نے قرن اول سے لیکر آج تک لاتعداد کتابیں اس موضوع پر تحریر فرمائی ہیں اور ان میں اس موضوع پر (بڑی تعداد میں) احادیث کو جمع کیا ہے۔

بطور مثال ہم دو حدیثیں نقل کرتے ہیں اور مزید مطالعہ کے شائق افراد کو ہم کتاب ''مہدی (عج) انقلابی بزرگ''، ''نوید امن وامان''، صدر الدین صدر کی کتاب ''المہدی'' وغیرہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا:

"لو لم یبق من الدھر الا یوم لطوّل اللہ ذلک الیوم حتی یبعث رجلا من اھل بیتی یملاھا قسطاً و عدلاً کما ملئت ظلما و جورا"

اگر دنیا کی زندگی کا آخری دن رہ جائے تو بھی خدا اس دن کو اتنا طولانی کرے گا کہ میرے اہل بیت سے ایک شخص کو مبعوث کرے تاکہ وہ زمین کو اسی طرح عدل وانصاف سے بھر دے جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوئی ہے (۱)

---

۱) یہ حدیث اہل سنت اور اہل تشیع کی اکثر کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"اذا قام القائم حکم بالعدل و ارتفع الجور فی ایامه و امنت به السبل و اخرجت الارض برکاتها، و رد کل حق الی اهله، ...... و حکم بین الناس بحکم داود و حکم محمدؐ فیحنئذ تظهر الارض کنوزها، و تبدی برکاتها، و لا یجد الرجل منکم یومئذ موضعاً لصدقته و لبره، لشمول الغنی جمیع المؤمنین......"

جب حضرت قائم عج ظہور فرمائیں گے تو اپنی حکومت کی بنیاد عدل وانصاف پر رکھیں گے، ان کے دور حکومت میں زمین سے ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے گا انکے وجود کی برکت سے راستے پر امن ہو جائیں گے، زمین اپنی برکات (خزائن) کو اگل دے گی اور حق اسکے حقدار تک پہنچ جائیگا...... وہ حضرت مہدی (عج) انسانوں کے تمام مسائل کو اسی طرح حل کریں گے جیسے حضرت داؤد (ع) اور حضرت محمدؐ حل فرماتے تھے اس وقت زمین اپنے خزانوں کو ظاہر کردے گی اور اپنی برکات کو واضح کردے گی اس وقت کوئی شخص خیرات، صدقہ اور مالی امداد دینے کیلئے کسی مستحق کو تلاش نہ کرسکے گا کیونکہ تمام مومنین بے نیاز اور غنی ہو جائیں گے (۱)

ہم جانتے ہیں کہ امام عصر (عج) کی غیبت کے زمانے میں امامت اور ولایت کے معین شدہ خطوط کا تحفظ اور انکی بقاء امامؑ کے عام نائبین یعنی علماء وفقہاء کے ذریعے ہوتی ہے۔

---

۱) بحار الانوار جلد ۱۳ (چاپ قدیم)

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) دنیا کے مستقبل کے بارے میں خداپرست اور مادہ پرست لوگوں کے نظریات میں کیا فرق ہے؟

۲) کیا فطرت کے اصولوں سے حضرت حجت (عج) کے ظہور کو سمجھا جاسکتا ہے؟

۳) اگر اس ظہور کے بارے میں عقلی دلائل ہیں تو بیان کریں؟

۴) ظہور کے بارے میں قرآنی نظریہ بیان کریں؟

۵) احادیث وسنت کے ذریعے سے "ظہور حضرت مہدی عج" کا تجزیہ کیجئے؟

معاد

پہلا سبق:

ایک اہم سوال

موت اختتام ہے یا آغاز؟

بہت سے لوگ موت سے ڈرتے ہیں، کیوں؟

موت ہمیشہ لوگوں کی نظروں میں ایک وحشتناک ہیولا کی صورت میں ابھرتی رہی ہے ،بہت سے مقامات پر صرف اسکی سوچ اور فکر ہی زندگی کا سارا مزہ خراب کردیتی ہے۔

لوگ نہ صرف موت سے ڈرتے ہیں بلکہ قبرستان کے نام سے بھی دور بھاگتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ قبور اور مقبروں پر زرق و برق آرایش و زیبائش کرکے اسکی حقیقت سے غافل ہوجائیں۔

موت کا یہ خوف ادبی دنیا کے مختلف آثار میں بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے اور ہمیشہ سے اسے مختلف انداز مثلاً ''موت کا ہیولا''،''موت کا پنجہ''،''موت کا طمانچہ'' اور اس قسم کے دوسرے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے!

(ایرانی کلچر میں) جب کوئی چاہتا ہے کہ کسی مردے کا نام لے تو اس لیے کہ سامنے والا

وحشت نہ کھائے پہلے اس قسم کے جملے ''اب سے دور''،''میری زبان گنگ ہو''،''سات پہاڑ درمیان ہوں''،''جو اسکی خاک ہے وہ تمہاری عمر ہو'' وغیرہ لاکر کوشش کرتا ہے کہ سننے والے اور موت کے ذکر کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردے۔

لیکن ہمیں تحقیق و تجزیہ کیساتھ یہ بات معلوم کرنی چاہئے کہ انسانوں میں ہمیشہ سے پائی جانے والی اس وحشت کا سبب اور سرچشمہ کیا ہے؟

جبکہ اس عمومی کیفیت کے برعکس بعض لوگ نہ صرف یہ کہ موت سے خائف نہیں ہوتے بلکہ موت کے سامنے مسکراتے ہیں اور فخریہ انداز سے موت کے استقبال کیلئے قدم بڑھاتے ہیں؟ ایسا کیوں ہے؟

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ جب بعض لوگ آب حیات اور اکسیر جوانی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے تو اس وقت کچھ لوگ جذبۂ عشق سے لبریز جہاد کے مورچوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور نہ صرف موت کا مسکرا کر سامنا کررہے تھے بلکہ اپنی طولانی زندگی سے شکوہ کرتے ہوئے ایسے دن کی آرزو لیے ہوئے تھے کہ جب وہ اپنے محبوب پروردگار کے دیدار اور مقام لقاء اللہ تک جا پہنچیں، اور آج بھی ہم حق و باطل کے محاذ پر اسی کیفیت کا واضح مشاہدہ کررہے ہیں کہ کس طرح حق پرست اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے شہادت کے استقبال کیلئے تیزی سے قدم بڑھاتے ہیں۔

خوف کی حقیقی وجہ

تحقیق اور غور و فکر کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے ہیں کہ ہمیشہ سے اس خوف کا بنیادی سبب صرف دو چیزیں ہیں:

۱) موت سے فنا مراد لینا

انسان ہمیشہ سے "نہ ہونے یا نیستی" سے بھاگتا ہے مثلاً بیماری سے بھاگتا ہے جو کہ موت وسلامتی کا "نہ ہونا" ہے، تاریکی سے ڈرتا ہے جو کہ روشنی کا نہ ہونا ہے محتاجی سے ڈرتا ہے جو کہ تونگری کو ختم کرنے والی ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی خالی مکان سے بھی ڈرتا ہے اور خالی راستے میں بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں "کوئی نہیں" ہوتا!

اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ مردے سے بھی ڈرتا ہے، مثلاً وہ کبھی اس بات کیلئے تیار نہیں ہوگا کہ کسی ایسے کمرے میں رات بسر کرے جس میں کوئی مردہ بھی ہو حالانکہ جب وہ شخص زندہ تھا تو یہ اس سے نہیں ڈرتا تھا!

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان "عدم اور نیستی" سے کیوں وحشت زدہ ہے؟ اسکی وجہ واضح ہے کیونکہ ہر موجود چیز دوسری موجود چیز سے آشنا ہے اور تعلق رکھتی ہے جبکہ کسی بھی موجود چیز کی "غیر موجود" سے آشنائی نہیں ہے، لھذا ہماری "عدم سے اجنبیت" مکمل طور پر طبیعی ہے۔

اب اگر ہم موت کو ہر چیز کا اختتام سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ مرنے سے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ موت سے ڈریں یہاں تک کہ اس کے نام اور اسکے خیال سے ہی وحشت کھائیں کیونکہ موت ہم سے ہر چیز چھین لیتی ہے۔

لیکن اگر موت کو ایک نئی جاودانی زندگی کا آغاز اور ایک بہت بڑے جہان کی طرف کھلنے والا دریچہ سمجھیں تو پھر اس صورت میں طبعاً نہ فقط ہم اس سے وحشت نہیں کھائیں گے بلکہ ان لوگوں کو مبارکباد بھی دیں گے جو پاکیزگی کے ساتھ سربلند کیے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

۲) سیاہ اعمال نامے

بعض ایسے لوگوں کو ہم جانتے ہیں جو موت سے مراد فنا اور عدم نہیں لیتے اور موت کے بعد زندگی کے بھی منکر نہیں ہیں لیکن اسکے باوجود وہ موت سے خوف زدہ ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ انکا اعمال نامہ اس قدر سیاہ اور تاریک ہے کہ وہ موت کے بعد کی دردناک سزاؤں سے خوف زدہ ہیں انکا حق ہے کہ وہ موت سے ڈریں کیونکہ وہ ایسے خطرناک مجرموں کی مانند ہیں جو جیل سے رہا ہونے سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب بھی انہیں جیل کی دیواروں سے باہر نکالا جائے گا تو باہر موجود لوگ انہیں زندگی سے بھی آزاد کر دیں گے وہ زندان کی محکم سلاخوں سے اس لئے نہیں چمٹے کہ وہ آزادی سے نفرت کرتے ہیں بلکہ وہ ایسی آزادی سے ڈرتے ہیں کہ جسکا نتیجہ سزائے موت ہے، اسی طرح ایسے بدکار بھی موت سے ڈرتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ انکی روح بدن کے تنگ قفس سے آزاد ہوتے ہی اپنے پلید و ذلیل اعمال اور ظلم وستم کی وجہ سے ایک بہت بڑی قادر ذات کے شکنجہ میں آنے والی ہے۔

لیکن وہ لوگ جو نہ تو موت کو فنا سمجھتے ہیں اور نہ ہی انکا اعمال نامہ سیاہ اور تاریک ہے وہ موت سے کیوں ڈریں؟

بلاشبہ وہ زندگی کو اسکی تمام رعنائیوں کے ساتھ چاہتے ہیں صرف اس لیے کہ اس سے موت کے بعد والے جہان اور اپنی نئی زندگی کیلئے خوب فائدہ اٹھا سکیں اور ایسی با مقصد اور پر افتخار موت کا استقبال کرنے کیلئے تیار ہوتے ہیں کہ جس میں خدا کی رضا و خوشنودی شامل ہو۔

دو مختلف نظریے

ہم کہہ چکے ہیں کہ لوگ دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ جنکی تعداد زیادہ ہے موت سے بیزار اور اس سے نفرت کرنے والے ہیں:

بعض وہ ہیں جو ایسی موت کہ جو کسی بڑے مقصد کی خاطر ہو جیسے ''اللہ کی راہ میں شہادت'' تو وہ اسکا استقبال کرتے ہیں یا کم از کم جب محسوس کریں کہ انکی طبعی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے تو وہ اپنے اندر کسی قسم کا رنج وغم نہیں پاتے۔

اسکی وجہ دو مختلف نظریوں کا ہونا ہے۔

پہلی قسم کے لوگوں کا یا تو موت کے بعد والے جہان پر ایمان نہیں ہوتا یا اگر ایمان ہو تو بھی انہیں ابھی تک صحیح طریقے سے اسکا یقین نہیں ہوتا لھذا وہ لحۂ موت کو تمام چیزوں سے جدائی کا لحہ سمجھتے ہیں یہ طے شدہ امر ہے کہ تمام چیزوں سے جدائی بہت ہی مشکل ہے، روشنی اور نور سے باہر نکلنا اور مطلق تاریکی میں قدم رکھنا بہت ہی دردناک ہے۔

اسی طرح ایک جیل سے آزاد ہو کر عدالت میں حاضر ہونا کسی ایسے مجرم کیلئے کہ جسکے جرائم کی فائل کھل چکی ہو بہت ہولناک اور وحشت انگیز ہے۔

دوسری قسم کے لوگ موت کو ایک نئی ولادت سمجھتے ہیں یعنی ایک محدود اور تاریک دنیاوی ماحول سے باہر نکلنا اور ایک بہت وسیع وعریض روشن جہان میں قدم رکھنا۔

ایک تنگ اور چھوٹے سے پنجرے سے آزاد ہو کر لامحدود آسمان میں پر کھولنا، ایک ایسے ماحول سے باہر نکلنا کہ جو لڑائیوں، کشمکشوں، تنگ نظریات، ناراضیوں، کینہ توزیوں اور جنگوں کا مرکز ہے اور ایسے ماحول میں قدم رکھنا جو ایسی تمام آلودگیوں سے پاک ہے

واضح ہے کہ وہ ایسی موت سے وحشت نہیں کھائیں گے بلکہ امیر المومنین علیؑ کی مانند کہیں گے:

"لابن ابی طالب انس بالموت من الطفل بثدی امه"

خدا کی قسم ابوطالب کے فرزند کا موت سے انس اس شیر خوار بچے سے زیادہ ہے جو ماں کی چھاتیوں سے مانوس ہے۔

یا اس فارسی شاعر کی مانند یہ اشعار زبان پر جاری کریں گے:

مرگ اگر مرد است گو نزد من آی — تا در آغوشش بگیرم تنگ تنگ!

موت اگر دلیر اور شجاع ہے تو اسے کہو کہ میرے پاس آئے تا کہ میں اسے اپنی گود میں بھینچ لوں۔

من ز او جانی ستانم جاودان — او ز من دلقی ستاند رنگ رنگ!

اسنے تو مجھ سے رنگ برنگے درویشانہ پیراہن لئے ہیں جبکہ میں نے اس سے دائمی زندگی لے لی ہے۔

کتنا اچھا لگتا ہے کہ جب ہم اسلامی تاریخ میں امام حسینؑ اور ان پر جان نچھاور کرنے والے انکے باوفا ساتھیوں جیسے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے لحہ شہادت قریب آ رہا تھا انکے چہروں پر شادابی اور چمک بڑھ رہی تھی اور وہ اپنے محبوب پروردگار کی ملاقات کے اشتیاق میں اپنے جسم میں نہیں سما رہے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے اوراق میں حضرت علیؑ"

پڑھتے ہیں کہ جب قاتل کی تلوار کی ضرب ان کے سر اقدس پر لگی تو انہوں نے زبان مبارک پر "فزت و رب الکعبۃ" کے کلمات جاری فرمائے یعنی ''کعبہ کے خدا کی قسم میں کامیاب ہوگیا''!

یہ واضح ہے کہ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی زندگی کو خوانخواہ خطرات میں ڈالے اور زندگی جیسی عظیم نعمت سے لاپرواہ ہوجائے اور عظیم مقاصد تک پہنچنے کیلئے زندگی سے فائدہ نہ اٹھائے۔

بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ انسان زندگی سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھائے اور کبھی بھی زندگی کے ختم ہوجانے کے خیال سے وحشت زدہ نہ ہو بالخصوص اسوقت کہ جب وہ اعلیٰ اور عظیم اہداف کی راہوں پر گامزن ہو۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں اور اسکی کیا وجوہات ہیں؟

۲) بعض لوگ موت کا سامنا کرتے وقت کیوں مسکراتے ہیں؟ اور اللہ کی راہ میں شہادت کے مشتاق کیوں ہوتے ہیں؟

۳) ''لمحۂ موت'' کو کس چیز کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے؟ باایمان پاکیزہ لوگ کیا محسوس کرتے ہیں؟ اور بے ایمان ناپاک لوگ کیا محسوس کرتے ہیں؟

۴) کیا آپ نے اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو موت سے نہ ڈرتے ہوں؟ کیا ایسا کوئی واقعہ آپ کو یاد ہے؟

۵) موت کے بارے میں حضرت علیؑ کی کیا رائے ہے؟

دوسرا سبق:

معاد کے بغیر زندگی بے معنی ہے

اگر اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان سے قطع نظر ملاحظہ کریں تو یہ بے معنی اور فضول لگے گی یہ زندگی بالکل ایسے ہی ہوگی جیسے ہم شکم مادر میں جنین کی زندگی کا اس دنیاوی زندگی سے قطع نظر ''تصور کریں''۔

وہ بچہ جو شکم مادر میں زندگی گزار رہا ہے اور اس تنگ و تاریک جیل میں کئی مہینوں کا قیدی ہے اگر اس وقت اسے عقل و دانائی حاصل ہو جائے اور وہ حالت جنین والی زندگی کے بارے میں سوچے تو یقینا حیران ہوگا۔

(اور اپنے آپ سے یہ سوال کرے گا)

میں کیوں اس تاریک جیل میں محبوس ہوں؟

کیوں میں یہاں پانی اور خون میں اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو حرکت دوں؟ زندگی کے آخر میں یہاں مجھے کیا نتیجہ حاصل ہوگا؟ میں کہاں سے آیا ہوں اور کس لیے آیا ہوں؟

لیکن اگر اسے یہ بتایا جائے کہ یہ ایک ابتدائی دور ہے یہاں تمہارے اعضاء کی شکل و صورت بنتی ہے انہیں قوت ملتی ہے تاکہ ایک وسیع تر دنیا میں حرکت کیلئے تیار رہیں، تو مہینے گزرنے کے بعد تمہیں اس جیل سے آزادی کا پروانہ مل جائیگا اور تم ایسی دنیا میں قدم رکھو

گے کہ جہاں چمکتا سورج اور روشن چاند، سرسبز درخت اور پانی کی جاری نہریں اور بہت سی اقسام کی نعمتیں ہونگی تو اس وقت وہ اطمینان بھرا سانس لے گا اور کہے گا کہ میں اب سمجھا کہ یہاں میرے وجود کا فلسفہ کیا ہے!

یہ ایک ابتدائی مرحلہ ہے، دوسری دنیا تک رسائی کیلئے ایک پل ہے۔

یہ ایک بڑی یونیورسٹی تک جانے کی کلاس ہے۔

لیکن اگر جنین کی زندگی کا دنیاوی زندگی سے تعلق ٹوٹ جائے تو ہر چیز تاریک اور بے معنی ہو جائے گی اور شکم مادر ایک وحشتناک اور اذیت ناک قید خانہ بن جائیگا جہاں بے ہدف اور بے نتیجہ زندگی کے چند لمحات گزر رہے ہیں۔

اس دنیاوی زندگی کی ''موت کے بعد والے جہان کے ساتھ تعلق کی'' یہی نوعیت ہے۔

کیوں ضروری ہے کہ ہم ستر سال یا اس سے کم و بیش اس دنیا کی مشکلات میں ہاتھ پاؤں ماریں؟

کچھ عرصہ خام اور بے تجربہ رہیں اور جب ہمارے اندر پختگی پیدا ہو تو ہماری عمر تمام ہو جائے!

ایک مدت ہم علم و دانش حاصل کریں اور جب ہم علمی حوالے سے کسی مقام تک جا پہنچیں تو بڑھاپے کی چاندنی ہمارے سروں سے جھانکنے لگے! اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم زندگی کیوں گزار رہے ہیں؟ غذا کھانے کیلئے، لباس پہننے کیلئے، سونے کیلئے؟ کیا انہی چیزوں کا کئی سال تکرار کرنا ہی زندگی ہے؟ واقعا کیا، یہ بہت بڑا آسمان، یہ وسیع و عریض زمین اور یہ سب چیزیں کیا یہ علم اور تجربات کا حاصل کرنا، یہ [illegible]

صرف اسی کھانے، پینے اور پہننے کیلیے اور اسی پست تکراری زندگی کیلیے ہے؟

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں معاد کو قبول نہ کرنے والوں کیلیے زندگی کی بے وقعتی یقینی ہوجاتی ہے کیونکہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو زندگی کا ہدف اور مقصد شمار کریں جبکہ وہ موت کے بعد والے جہان پر ایمان بھی نہیں رکھتے۔

لھذا دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ ایسی فضول اور بے معنی زندگی سے نجات حاصل کرنے کیلیے خودکشی جیسے اقدام کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن اگر ہم مان لیں کہ دنیا آخرت کیلیے ''مزرعہ'' ہے، دنیا ایک ایسا کھیت ہے کہ جسمیں ہمیں چاہیے کہ بیج ڈالیں اور اسکا ثمرہ ایک جاودانی اور ابدی زندگی میں اٹھائیں۔

دنیا ایک ایسا ''سکول'' ہے کہ جسمیں کچھ معلومات حاصل کریں، اور اپنے آپ کو ہمیشہ رہنے والے گھر میں زندگی کیلیے تیار کریں، دنیا ایک راستہ اور پل ہے کہ جسے ہم ضرور عبور کریں۔

اس صورت میں دنیاوی زندگی فضول اور بے معنی نہیں ہوگی بلکہ ایک ابتدائی دور ہوگا ایک ایسی ابدی اور جاودانی زندگی کیلیے کہ جسکے لیے جسقدر کوشش کریں کم ہے۔ ہاں صرف معاد پر ایمان زندگی کو بامعنی اور بامقصد بناتا ہے اور اسے اضطراب، پریشانی اور بے وقعتی سے نجات دیتا ہے۔

انسانی تربیت میں عقیدہ معاد کا اہم کردار

روز آخرت ایک بڑی عدالت کے قیام پر ایمان کے علاوہ معاد کا عقیدہ ہماری موجودہ دنیاوی زندگی میں بھی بہت زیادہ اثر رکھتا ہے۔

فرض کریں اگر کسی ملک میں یہ اعلان ہوجائے کہ سال کے فلاں دن میں کسی جرم کی سزا نہیں ملے گی کوئی مقدمہ نہیں چلے گا لوگ چاہیں تو ہر قسم کی سزا اور پکڑ دھکڑ کے نہ ہونے سے آسودہ خاطر ہوکر وہ دن گزار سکتے ہیں پولیس اور تمام قانونی ادارے چھٹی کریں گے عدالتیں بند ہونگی یہاں تک کہ دوسرے دن جب معمول کے مطابق زندگی شروع ہوگی تب بھی اس دن کے جرائم کو عدالتوں میں پیش نہیں کیا جائیگا۔

ذرا سوچیے اس روز پورے معاشرے کی کیا حالت ہوگی؟ معاد پر ایمان دراصل ایک ایسی عظیم عدالت پر ایمان ہے کہ جسکا دنیا کی عدالت سے کبھی بھی مقایسہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس عظیم عدالت کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ایک ایسی عدالت ہے کہ جسکے قوانین پر نہ سفارش اثر انداز ہے اور نہ تعلقات اور نہ وہاں قاضی کی سوچ کو جھوٹے دلائل کے ساتھ تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

۲) ایسی عدالت کہ اس جہان کی مانند تکلفات کی محتاج نہیں ہے اس لیے وہاں لمبے اور تفصیلی مراحل کی ضرورت نہیں ہے بجلی کی سی تیزی سے معاملہ پر غور ہوگا اور انتہائی دقت کے ساتھ حکم صادر ہوگا۔

۳) ایسی عدالت کہ جہاں لوگوں کے جرم کے گواہ خود انکے اعمال ہونگے یعنی خود اعمال وہاں حاضر ہونگے اور اپنے فاعل کے ساتھ اپنے تعلقات کو اسطرح واضح کریں گے کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔

۴) اس عدالت میں گواہ ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ، زبان اور انسان کے جسم کی جلد ہوگی۔ یہاں تک کہ ایسے گھر جہاں گناہ یا کار خیر ہوا ہے اسکی

بھی گواہ ہونگی ایسے گواہ ہونگے کہ جو انسان کے اعمال کے نتائج کی طرح قابل انکار نہیں ہونگے۔

۵) یہ عدالت ایسی عدالت ہے کہ جسکا حاکم خدا ہے وہ خدا جو ہر چیز سے آگاہ، ہر چیز سے بے نیاز اور ہر ایک سے زیادہ عادل ہے۔

۶۔ اس کو چھوڑیں، وہاں سزا اور جزا صرف حکم کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر خود ہمارے ہی اعمال سزا یا جزا کیلئے شکل تبدیل کریں گے اور ہمارے ہی ساتھ ہونگے یا تو ہمیں اذیت دیں گے یا آسایش ونعمت میں لے جائیں گے ایسی عدالت پر ایمان ہی انسان کو اس مقام پر لے جاتا ہے کہ وہ علیؑ کی مانند کہتا ہے۔

"خدا کی قسم اگر مجھے نرم بستر کی بجائے راتوں کو صبح تک خاردار جھاڑی کے کانٹوں پر جاگتے ہوئے گزارنا پڑے اور میرے ہاتھوں اور پاؤں کو زنجیر میں مقید کر کے مجھے گلیوں اور بازاروں میں گھسیٹا جائے یہ مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ اور اسکے رسول سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو یا مال دنیا میں سے کوئی چیز غصب کی ہو"

(نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴)

اس عدالت پر ایمان انسان کو یہ درس دیتا ہے کہ وہ آگ سے سرخ جلتا ہوا لوہا اس بھائی کے ہاتھ کے قریب کرے جو چاہتا تھا کہ بیت المال سے خصوصی حصہ لے جائے اور جب بھائی بلبلاتا ہے تو اسے ڈراتے ہوئے کہتا ہے "تو اس آگ کے معمولی سے شعلے سے جو کہ انسانوں کے ہاتھوں میں کھلونوں کی مانند ہے بلبلا رہا ہے لیکن اپنے بھائی کو ایسی ہولناک آگ کی طرف کھینچ رہا ہے جو پروردگار کے قہر وغضب سے بھڑک رہی ہے (نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴)

آیا ایمان کے اس مرتبے پر فائز انسان کو فریب دیا جاسکتا ہے؟ آیا رشوت کے ساتھ اسکے ضمیر کو خریدا جاسکتا ہے؟

آیا ممکن ہے کہ اسے لالچ یا دھمکی سے راہ حق سے ہٹا کر ظلم وستم پر مجبور کیا جائے؟

قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "جب گناہ گار اپنے نامہ اعمال کو دیکھیں گے تو انکی فریاد بلند ہوگی اور وہ کہیں گے:

"مال هذا الكتاب لا يغادر صغيرة و لا كبيرة الا احصاها" (سورہ کھف آیت ۴۹)

یہ کیسا نامہ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے۔

اس دن پر عدالت کے ایمان سے روح انسان کی گہرائیوں میں ہر کام کرتے وقت ذمہ داری کے احساس کی ایک طاقتور موج پیدا ہوتی ہے اور یہی احساس اسے ہر قسم کے انحراف، ظلم وگمراہی اور زیادتی کے مدمقابل کنٹرول کرتا ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) اگر دنیا کی اس محدود اور عارضی زندگی کے بعد کوئی اور جہان نہ ہو تو کیا ہوگا؟

۲) مبدا اور معاد کے منکر افراد میں سے کچھ لوگ خودکشی کیوں کرتے ہیں؟

۳) روز قیامت کی عدالت اور اس دنیا کی عدالتوں میں کیا فرق ہے؟

۴) معاد پر ایمان انسان کے اعمال پر کیا اثر ڈالتا ہے؟

۵) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بھائی عقیل سے کیا فرمایا؟

انہوں نے کیا چاہا تھا اور علی علیہ السلام نے اسے کیا جواب دیا؟

تیسرا سبق

روز قیامت کی عدالت کا نمونہ خود آپکے وجود میں ہے!

جہاں تک موت کے بعد زندگی اور روز قیامت کی عظیم عدالت کا تعلق ہے یہ اس محدود جہان میں قید کسی بھی انسان کیلئے ایک نئی بات ہے۔

اللہ تعالی نے اس عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہماری اس دنیا میں بھی پیش کیا ہے جسکا نام "ضمیر کی عدالت" ہے لیکن یہ بات نہ بھولیں کہ یہ اس عدالت کا چھوٹا سا نمونہ ہے!

اس بات کی زیادہ وضاحت یہ ہے کہ انسان جو بھی اعمال بجالاتا ہے وہ چند عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں سب سے پہلی عدالت اپنی تمام تر کمزوریوں اور نقائص کے باوجود یہی دنیا کی معمولی عدالتیں ہیں اگر چہ یہی معمولی عدالتیں جرائم کی کمی میں کچھ حد تک اثر انداز ہیں لیکن ان عدالتوں کی اساس و بنیاد ایسی ہے کہ کبھی بھی ان سے مکمل عدالت کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

کیونکہ جب تک ان میں غیر مناسب قوانین اور خیانت کار قاضی ہوں تو انکا کردار واضح ہے رشوت خوریاں، پارٹی بازی، خصوصی تعلقات، سیاسی کھیل اور ہزاروں قسم کی دیگر برائیاں ان عدالتوں کو انکے ہدف سے اس طرح دور کر دیتی ہیں کہ یوں کہنا چاہیے کہ انکا نہ ہونا انکے ہونے سے بہتر ہے کیونکہ انکے ہونے سے منحرف لوگ

پورے ہوتے ہیں۔

اور اگر عدالتوں کے قوانین عادلانہ ہوں اور قاضی حضرات بھی اہل اور متقی ہوں پھر بھی بہت سے ایسے مجرم ہیں جو ایسی مہارت سے جرم کرتے ہیں کہ جرم کا ذرا سا بھی نشان باقی نہیں رہتا یا عدالت میں ایسے فائل بنواتے ہیں اور یوں ناٹک رچاتے ہیں کہ قاضی بے بس ہو جائے اور قوانین بے اثر ہو جائیں، دوسری عدالت جو اس سے زیادہ منظم اور دقیق ہے وہ ''مکافات عمل'' کی عدالت ہے۔

ہمارے ہر عمل کا ایک نتیجہ ہے جو کہ تھوڑی مدت یا لمبی مدت کے بعد بالآخر ہماری طرف پلٹ آئے گا اگر چہ یہ چیز قانون کلی نہیں لیکن اکثر مقامات پر یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے۔

ہم ایسی حکومتوں کو دیکھتے ہیں کہ جو ظلم وستم کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اور ان سے جو کچھ ہوتا ہے وہ کرتے ہیں لیکن آخر کار وہی جال جو وہ دوسروں کیلئے بچھاتے ہیں ان میں خود ہی پھنس جاتے ہیں انکے برے اعمال کے برے نتائج انہیں گھیر لیتے ہیں وہ یوں بلندیوں سے گرتے ہیں اور نابود ہو جاتے ہیں کہ سوائے لعنت اور نفرین کے ان کیلئے کچھ باقی نہیں رہتا۔

مکافات عمل کا اعمال سے تعلق اسی طرح ہے جسطرح علت و معلول کا باہمی تعلق، یا آگ اور حرارت کا باہمی تعلق دنیا میں بہت کم لوگ مکافات عمل کی گرفت سے خاص منصوبہ بندی کی وجہ سے بچ نکلتے ہیں اس عدالت میں نقص یہ ہے کہ یہ عمومی اور کلی نہیں لھذا اس عدالت کے باوجود ہم روز قیامت کی عظیم عدالت سے بے نیاز نہیں ہیں۔

تیسری عدالت جو اس سے بھی منظم اور دقیق ہے وہ ''ضمیر کی عدالت'' ہے

در حقیقت جسطرح نظام شمسی کو تمام عجائب و غرائب کے ساتھ ایک چھوٹی سی شکل میں، ایک ایٹم میں دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ روز قیامت کی عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ و ماڈل ہمارے وجود میں بھی ہے۔

کیونکہ انسان کے وجود میں ایک ایسی پوشیدہ طاقت ہے کہ جسے فلاسفہ ''عقل عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور قرآن مجید میں اسے ''نفس لوامہ'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور سادہ الفاظ میں اسے ''ضمیر'' کہا جاتا ہے ادھر انسان سے نیکی یا برائی ہوئی فوراً بغیر کسی شور و شرابے کے یہ عدالت تشکیل پاتی ہے اور مکمل سنجیدگی اور اصولی انداز سے اپنا کام شروع کر دیتی ہے جسکے حکم کا نتیجہ سزا کی صورت میں یا روحانی حوصلہ افزائی یعنی اجر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

کبھی یہ عدالت مجرموں کو اندر سے یوں کوڑے مارتی ہے اور انہیں ایسا روحی شکنجہ دیتی ہے کہ وہ بازو کھول کر موت کا استقبال کرتے ہیں اور اسے ایسی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے وصیت نامے میں لکھتے ہیں کہ اگر ہم نے خودکشی کی ہے تو صرف ضمیر کی خلش سے نجات پانے کیلئے!

کبھی کوئی اچھا کام کرنے پر یہ عدالت انسان کی یوں حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ اس پر وجد و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے وجود میں گہرائی تک سکون محسوس کرتا ہے ایسا ناقابل بیان دل کو لبھانے والا سکون کہ جسکی لذت اور عظمت کو بیان کرنے کیلئے الفاظ نہیں مل سکتے اس عدالت کی بہت ہی عجیب خصوصیات ہیں

۱)اس عدالت میں قاضی، گواہ، حکم سنانے اور عدالت کی کاروائی دیکھنے والا سب ایک ہی ہے۔ وہی ضمیر کی طاقت گواہی دیتی ہے فیصلہ کرتی ہے اور پھر آستین کھول کر حکم جاری کرتی ہے

۲)دنیا کی پررونق عدالتوں کے برعکس کہ جہاں ایک فیصلہ ہوتے ہوتے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ یہاں فیصلہ فوری ہوتا ہے یہاں وقت اور مدت نہیں چاہیے البتہ کسی جرم کے دلائل ثابت ہونے اور دل کی نگاہ سے غفلت کے پردے اٹھنے میں ایک مدت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب جرم کے دلائل مل جائیں تو پھر حکم کا صدور فوری اور یقینی ہے۔

۳)اس عدالت میں حکم ایک ہی مرحلہ میں صادر ہوتا ہے کسی اور عدالت کی طرف رجوع، نظر ثانی اور سپریم کورٹ میں جانا وغیرہ کا اس میں کوئی وجود نہیں ہے۔

۴)اس محکمہ میں صرف سزا ہی نہیں ملتی بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح پہچاننے والوں کو اجر بھی ملتا ہے لھذا یہ وہ عدالت ہے کہ جہاں نیکی کرنے والے اور بدکار دونوں حاضر ہوتے ہیں اور ہر ایک کو اسکے عمل کی مناسبت سے جزا یا سزا ملتی ہے۔

۵)اس عدالت کی سزائیں کسی بھی طرح دنیا کی سزاؤں سے شباہت نہیں رکھتیں ظاہراً نہ کوئی قید، نہ کوڑے اور نہ تختہ دار لیکن کبھی یہ سزا اسقدر اندر سے جلاتی ہے اور ایسے قید خانہ میں ڈال دیتی ہے کہ دنیا اپنی تمام تر وسعت کے باوجود انسان کیلئے تنگ ہو جاتی ہے، ایک وحشتناک اور خوف زدہ کرنے والے قید خانہ سے بھی تنگ۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ عدالت دنیا کی کسی قسم کی عدالتوں کی مانند نہیں ہے بلکہ قیامت کی عدالت کی مانند ہے۔

اس عدالت کی عظمت اسقدر ہے کہ قرآن نے اس کے نام کی قسم کھائی ہے اور روز

قیامت کی عدالت کے ساتھ اسکا ذکر کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

" لا اقسم بیوم القیامۃ و لا اقسم بالنفس اللوامۃ ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ"

(سورہ قیامت آیات ۱تا۴)

"قسم ہے قیامت کے دن کی اور قسم ہے سرزنش کرنے والے بیدار ضمیر کی، آیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اسکی بکھری ہوئی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے کیوں نہیں ہم قادر ہیں کہ اسکی انگلیوں کو روز اول کی مانند بنا لیں۔

البتہ یہ عدالت ان تمام خصوصیات کے باوجود پھر بھی دنیاوی ہے کچھ ایسے نقائص رکھتی ہے کہ جسکی وجہ سے وہ ہمیں قیامت کی عدالت سے بے نیازی نہیں کر سکتی کیونکہ:

۱)ضمیر کی وسعت میں ہر چیز نہیں آ سکتی، ہمیشہ ضمیر کی وسعت انسان کی فکر اور تشخیص کے مطابق ہوتی ہے۔

۲)کبھی ماہر فریبی انسان چاہے تو اپنے ضمیر کو بھی فریب دے سکتا ہے جب کہ ضرب المثل ہے کہ "ضمیر کی آنکھوں میں دھول جھونکنا"

۳)کبھی بعض گناہ گاروں میں ضمیر کی آواز اسقدر کمزور ہوتی ہے کہ وہ نہیں سنتے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں چوتھی عدالت" قیامت کی عظیم عدالت" کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) انسان حقیقتاً کتنی عدالتوں میں پیش ہوتا ہے؟

۲) پہلی عدالت کی خصوصیات اور اسکا نام کیا ہے؟

۳) دوسری عدالت کی خصوصیات کون کونسی ہیں؟

۴) تیسری عدالت کی کیا خصوصیات ہیں؟

۵) ضمیر کی عدالت کی خصوصیات اور نقائص شمار کریں۔

چوتھا سبق

فطرت کی تجلیوں میں معاد

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا شناسی انسان کی فطرت میں ہے اگر کسی باضمیر انسان پر تحقیق ریسرچ کریں تو اس میں ایک ایسے ماوراء طبیعت خالق پر ایمان اور اسکے ساتھ انس کا جذبہ پائیں گے کہ جس نے اپنے علم، پروگرام اور ہدف کے ساتھ اس کائنات کو پیدا کیا۔ لیکن یہ بات صرف توحید اور خدا شناسی تک منحصر نہیں ہے بلکہ دین کے تمام اصول اور بنیادی فروعی مسائل فطرت میں ہونے چاہیے، کیونکہ اسکے علاوہ تو کبھی بھی تکوینی اور تشریعی احکام میں موافقت حاصل نہیں ہوسکتی (اس نکتہ پر توجہ فرمائیں)

ہم اگر اپنے دلوں پر ایک نگاہ ڈالیں اور اپنی روح و جان کی گہرائیوں میں اتریں تو ہم باطنی کانوں سے یہ روحانی زمزمہ سنیں گے کہ زندگی موت سے ختم نہیں ہوتی بلکہ موت تو عالم بقاء کی طرف کھلنے والا دریچہ ہے!

اس حقیقت کو صحیح طریقے سے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل نکات پر توجہ کریں۔

۱) بقاء کے ساتھ عشق

اگر واقعاً انسان "فنا اور ختم ہونے کیلئے" پیدا کیا جاتا تو [illegible] "فنا" [illegible] عشق

کرتا ایک مدت زندگی گزارنے کے بعد موت سے لذت حاصل کرتا لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ موت کی صورت (فنا کے معنی کے ساتھ) انسان کیلئے کسی بھی دور میں نہ صرف باعث خوشی نہیں رہی بلکہ وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ اس سے فرار کرتا رہا ہے۔

لمبی عمر کے حصول کیلئے بھاگ دوڑ، جوانی وطاقت کی خواہش، آب حیات کی تلاش و غیرہ ہر ایک اسی حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

پس بقاء کے ساتھ یہ انس اور عشق واضح کر رہا ہے کہ ہم لوگ باقی رہنے کیلئے پیدا کیے گئے ہیں اور اگر ہم ختم ہونے کیلئے پیدا کیے جاتے تو یہ بقاء کے ساتھ انس اور عشق بے معنی ہوتا۔

وہ تمام بنیادی محبتیں جو ہمارے اندر ہیں وہ ہمارے وجود کو مکمل کرتی ہیں اسی طرح اپنی بقا کے ساتھ عشق بھی ہمارے وجود کو مکمل کرتا ہے۔

یاد رکھیں ہم معاد کی بحث کو "پروردگار حکیم ودانا کے وجود کو قبول کرنے کے بعد کر رہے ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ جو کچھ اس نے ہمارے وجود میں پیدا کیا ہے اسمیں حکمت پوشیدہ ہے اسی لیے انسان کا اپنی بقا کے ساتھ انس بھی حکمت رکھتا ہے اور وہ حکمت "اس جہان کے بعد ایک اور جہان میں وجود" کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی۔

۲) گذشتہ اقوام میں موت کے بعد زندگی کا تصور

جس طرح انسانی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ زمانہ قدیم سے گذشتہ اقوام میں مذہب کسی نہ کسی انداز میں موجود رہا ہے اسی طرح زمانہ قدیم سے "موت کے بعد انسانی زندگی" کے عقیدے کی موجودگی پر بھی گواہی دیتی ہے۔

قدیم دور کے انسانوں بلکہ تاریخ سے ماقبل کے انسانوں کے آثار قدیمہ میں مردوں کی مخصوص طرز کی قبریں اور انکے دفن کے طریقے یہ سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ وہ موت کے بعد زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔

یہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ جسکی جڑیں ہمیشہ انسانوں میں رہی ہیں اسے محض ایک سادہ سی بات یا ایک عادت یا ایک تلقین نہیں لیا جاسکتا۔ ہمیشہ جب بھی کسی عقیدہ کو بطور راسخ اور پوری تاریخ میں ہر انسانی معاشرے میں پائیں تو یہ اسکے فطری ہونے کی دلیل ہے چونکہ تنہا فطرت ہی وہ چیز ہے جو گزرتے ادوار اور معاشرتی وفکری تغیرات کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکتی ہے ورنہ عادت، رسم اور تلقین زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بھلا دی جاتی ہیں۔

(مثلاً) فلاں طرح کا لباس پہننا یا تو ایک عادت ہے یا آداب ورسوم کا ایک حصہ ہے لھذا یہ چیز ماحول کی تبدیلی یا زمانہ کے گزرنے کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے۔

لیکن ماں کی بچے کے ساتھ محبت ایک غریزہ فطری ہے لھذا نہ تو ماحول کی تبدیلی اس محبت کی تپش کو کم کر سکتی ہے اور نہ گزرتے زمانہ کی گردوغبار اس کے بھلانے کا سبب بن سکتی ہے پس جو بھی اندرونی کشش اس صورت میں جلوہ گر ہو تو یہ اسکے انسانی فطرت کا حصہ ہونے کی دلیل ہے۔

جب دانشور یہ کہتے ہیں "گہری تحقیقات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانوں کے ابتدائی ترین گروہ بھی کسی نہ کسی مذہب کے پیرو تھے کیونکہ وہ اپنے مردوں کو خاص انداز سے دفن کرتے تھے انکے کام کرنے کے آلات انکے نزدیک رکھتے تھے اور اس طریقے سے دوسری دنیا کے وجود پر اپنے عقیدہ کو ثابت کرتے تھے ("جامعہ شناسی" Sociology کینگ صفحہ ۱۹۲) تو ہم اچھی طرح جان لیں گے کہ یہ قومیں [illegible] کی زندگی کو قبول

کر چکی تھیں اگر چہ وہ اس عقیدہ میں غلط راہ پر چل پڑے اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ زندگی بالکل اسی زندگی کے مشابہ ہے اور وہاں ان وسائل و آلات کی ضرورت ہوگی۔

۳) انسان کے اندر پایا جانے والا محکمہ احتساب بنام ''ضمیر'' معاد کے فطری ہونے پر ایک اور گواہ ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ہم نے کہا تھا کہ ہم سب اچھی طرح یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری اندر کی ''عدالت'' ہمارے اعمال کی جانچ پڑتال کرتی ہے نیکیوں کے بدلے جزا دیتی ہے تو اسوقت اسقدر اپنے اندر سکون کا احساس کرتے ہیں اور ہماری روح خوشی ونشاط سے لبریز ہو جاتی ہے کہ یہ لذت کسی بھی انداز سے نا قابل بیان اور نا قابل تحریر ہے اور یہ عدالت برے کاموں پر خصوصاً بڑے گناہوں پر اسقدر سزا دیتی ہے کہ انسان کی زندگی ہر حوالے سے تلخ ہو جاتی ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ ایک جرم مثلاً قتل کا ارتکاب کرنے اور اسکے بعد عدالت کی گرفت سے فرار ہونے کے بعد عدالت میں اقرار کیلئے حاضر ہو جاتے ہیں اور اپنی پہچان کرواتے ہیں اور تختہ دار پر چڑھ جاتے ہیں اس چیز کی دلیل وہ ضمیر کے شکنجہ سے نجات پانا ذکر کرتے ہیں۔

انسان اپنے اندر اس عدالت کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ:

یہ کیسے ممکن ہے میں ایک معمولی وجود رکھنے والا انسان اپنے اندر ایسی عدالت رکھوں اور اتنا بڑا عالم، یہ جہانِ خلقت ایسی عدالت کا حامل نہ ہو جو اسکے مناسب ہو؟

اسی ترتیب سے تین راہوں سے معاد اور موت کے بعد زندگی کے عقیدہ کے فطری

ہونے کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

بقاء سے عشق کے ذریعہ۔

تاریخ عالم میں اس پر ایمان کے پائے جانے سے۔

اور انسان کے وجود میں اسکے چھوٹے سے نمونہ کے پائے جانے سے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) کس طرح فطری امور کو غیر فطری امور سے جدا کیا جاسکتا ہے؟

۲) انسان بقاء کے ساتھ کیوں عشق کرتا ہے؟ اور یہ بقاء کے ساتھ عشق کس طرح معاد کے فطری ہونے پر دلیل ہے؟

۳) آیا گذشتہ اقوام بھی معاد پر ایمان رکھتی تھیں؟

۴) ضمیر کی عدالت ہمیں جزا یا سزا دیتی ہے؟ کس دلیل کے ساتھ؟ اسکے چند نمونوں کی تشریح کریں؟

۵) ضمیر کی عدالت اور قیامت کی عظیم عدالت کے درمیان کیا ربط موجود ہے؟

پانچواں سبق

قیامت عدل کے ترازو میں

کائنات کے نظام اور قوانین تخلیق میں تھوڑی سی دقت کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ قانون کی حکمرانی ہے اور ہر چیز اپنے مقام پر موجود ہے۔

انسانی بدن میں ہر عادلانہ نظام اتنی ظرافت کے ساتھ جاری ہے کہ اسمیں معمولی سی غیر موضوع تبدیلی بیماری یا موت کا باعث بن جاتی ہے۔

مثلاً آنکھ، دل اور مغز میں ہر چیز بالکل اپنی جگہ پر موجود ہے اسی انداز سے یہ عدالت اور نظم نہ صرف انسانی بدن کی ساخت میں بلکہ پورے جہان آفرینش میں حاکم ہے اسی لیے کہا گیا کہ :

"بالعدل قامت السموات والارض"

"عدل کی وجہ سے تمام آسمان اور زمین قائم ہیں"

ایک ایٹم اس قدر چھوٹا ہے کہ کئی ملین ایٹموں کو سوئی کی نوک پر اکٹھا کیا جاسکتا ہے، ذرا سوچیے اسکا جسم کس قدر دقیق اور منظم ہوگا کہ کئی ملیون سال تک اپنی زندگی کو قائم رکھتا ہے۔

یہ نظم الیکٹرونوں اور پروٹونوں کے دقیق نظام میں غیر معمولی حساب کتاب اور عدالت کی وجہ سے ہے کوئی بھی چھوٹا اور بڑا وجود اس حیران کن نظام [illegible]

آیا واقعاً انسان ایک منفرد وجود ہے؟ یا اس وسیع جہان میں ایک اجنبی پیوند ہے کہ آزاد رہے اور جو کچھ بھی چاہے بے نظمی، ظلم اور بے عدالتی اسکا ارتکاب کرے؟ یا یہاں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے؟

اختیار اور ارادہ کی آزادی

حقیقت یہ ہے کہ انسان کائنات کے تمام موجودات کے ساتھ ایک اساسی و بنیادی امتیاز رکھتا ہے اور وہ انسان کا ''اختیار اور ارادہ کی آزادی کا حامل ہونا ہے خدا نے اسے آزاد کیوں پیدا کیا؟ اور کسی چیز کے ارادہ کا حق اسے کیوں دیا ہے تا کہ وہ جو چاہے اسے کرے؟

اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ آزاد نہ ہوتا تو کمال کی منزل نہ پاتا۔ یہ بہت بڑی خصوصیت اسکے اخلاق اور معنویت کے کمال کی ضامن ہے، مثلاً اگر کسی کو نیزے کی نوک سے دھکیل کر مساکین کی مدد پر یا معاشرہ کے دوسرے امور خیر پر مجبور کیا جائے تو اگر چہ یہ نیک کام ہونا شروع ہو جائیں گے لیکن اس میں مدد کرنے والے کیلئے کسی قسم کا اخلاقی اور انسانی کمال حاصل نہیں ہوگا۔

حالانکہ اگر وہ اپنے ارادہ اور رغبت کے ساتھ ان کاموں کا ایک فی صد حصہ انجام دیتا تو اسی قدر وہ اخلاقی اور معنوی کمال کی راہوں میں قدم بڑھاتا، اسی لیے اخلاقی اور معنوی کمال کی پہلی شرط اختیار اور ارادہ کی آزادی رکھنا ہے یعنی انسان بذات خود اپنے پاؤں پر یہ راہ طے کرے نہ کہ مجبوری سے، جیسا کہ کائنات کے نظام مادہ میں اسباب و مسببات کا جبری نظام حاکم ہے، اور اگر اللہ تعالی نے انسان کو اختیار جیسی عظیم نعمت بخشی ہے تو صرف اسی اعلی

مقصد کے حصول کیلئے ہے لیکن یہ عظیم نعمت اس پھول کی مانند ہے کہ جسکے گرد کانٹے بھی اگ آئے ہیں اور وہ لوگوں کا اس نعمت آزادی سے غلط فائدہ اٹھانا اور ظلم وفساد اور گناہ سے آلودہ ہونا ہے۔

البتہ خدا کیلئے کوئی مانع نہیں کہ اگر انسان ظلم وستم سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرے تو وہ اسے ایسے عذاب میں مبتلا کرے کہ پھر وہ کبھی ایسا نہ سوچ (مثلا) اسکے ہاتھوں پر فالج ہو جائے، اسکی آنکھیں بے نور ہو جائیں، اسکی زبان کام کرنا چھوڑ دے ایسی صورت میں درست ہے کوئی بھی آزادی سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھائے گا اور گناہ کے پیچھے نہیں جائیگا لیکن پھر پرہیز گاری اور تقوی کی حیثیت محض جبری ہوگی اور یہ تقوی انسان کیلئے کسی بھی قسم کا کمال شمار نہیں ہوگا کیونکہ یہ سب نیکیاں اس شدید اور بغیر کسی وقفہ کے فوری نازل ہونے والی سزا کے خوف سے ہونگی۔

لھذا انسان کو ہر حال میں آزاد رہنا چاہیے اور پروردگار کی طرف سے آنے والے مختلف امتحانوں کا سامنا کرنا چاہیے اور اسے فوری عذاب سے سوائے چند موارد کے محفوظ رہنا چاہیے تا کہ وہ خود اپنے ذاتی کمالات کو ظاہر کر سکے۔

لیکن یہاں ایک چیز باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ:

اگر معاملہ یونہی رہے اور ہر کوئی اپنے لیے راستہ منتخب کرلے تو یہ چیز کائنات پر حاکم اللہ کی عدالت کے قانون کے خلاف ہے یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ انسان کیلئے ایک ایسی عدالت اور محکمہ بنایا گیا ہے کہ جہاں سب بغیر کسی استثناء کے حاضر ہونگے اور اپنے اعمال کی جزا پائیں گے اور اس جہان آفرینش کی عمومی عدالت سے اپنا حصہ وصول کریں گے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا کے تمام نمرود، فراعنہ، چنگیز اور قارون ظلم وستم میں ایک عمر مشغول رہیں اور انکا کوئی حساب وکتاب نہ ہو؟

آیا ممکن ہے گناہ گار اور پرہیزگار پروردگار کے میزان عدالت کے پلڑے میں ایک حیثیت کے حامل ہوں؟

بقول قرآن کے:

"افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون" (سورہ القلم آیت ۳۵،۳۶)

کیا ہم مسلمانوں کو مجرمین جیسا بنا دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟

ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے:

"ام نجعل المتقین کالفجار" (سورہ ص آیت ۲۸)

آیا (ممکن ہے کہ ہم) اہل تقویٰ کو بدکاروں کی طرح قرار دیں۔

درست ہے کہ بعض گناہ کار اس جہان میں ہی مکافات عمل کے ذریعے سے اپنے برے اعمال کی سزا پالیتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ضمیر کی عدالت بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ گناہ اور ظلم وستم کا ردعمل اور بے عدالتی کے برے نتائج کبھی خود ہی انسان کے دامن کو گھیر لیتے ہیں۔

لیکن اگر ہم صحیح دقت کریں تو دیکھیں گے کہ ان تینوں چیزوں میں سے کوئی بھی اتنی عمومی اور کلی نہیں کہ ہر ظالم اور گناہ کار کو اسکے جرم کے مطابق سزا ملے بہت سے ایسے ظالم ہیں جو مکافات عمل، ضمیر کی عدالت اور برے نتائج کے پنجوں سے فرار کر جاتے ہیں یا کافی

حد تک سزا نہیں ہوتی۔

اس قسم کے افراد اور دیگر تمام لوگوں کیلئے ضروری ہے کہ ایسا محکمہ عدل ہو کہ جہاں سوئی کی نوک کے برابر اچھے اور برے کام کی پڑتال ہو ورنہ حقیقی عدالت حاصل نہ ہوگی۔

پس اسی لیے خدا کے وجود اور اسکی عدالت کو قبول کرنا قیامت کے قبول کرنے کے مساوی ہے یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) آسمان اور زمین کسطرح عدل کے ساتھ قائم ہیں؟

۲) انسان کو ارادہ اور اختیار کی آزادی کی نعمت کیوں دی گئی ہے؟

۳) اگر بدکار افراد اسی جہان میں اپنے اعمال کی شدید اور فوری سزا کو پالیں گے تو کیا ہوگا؟

۴) مکافاتِ عمل، ضمیر کی عدالت اور اعمال کے برے نتائج ہمیں قیامت کی عدالت سے بے نیاز کیوں نہیں کر سکتے؟

۵) پروردگار کی عدالت اور مسئلہ معاد کے درمیان کیا تعلق ہے؟

چھٹا درس

موت کے بعد کی زندگی اسی جہان میں کئی دفعہ مشاہدہ ہو چکی ہے

قرآنی آیات بخوبی اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ بت پرست اور تمام کفار نہ صرف زمانہ پیغمبرؐ بلکہ تمام ادوار میں معاد اور موت کے بعد زندگی کے مسئلے پر حیرت کا شکار اور وحشت زدہ رہے ہیں یہاں تک کہ جو بھی اسکا قائل ہوتا اسے مجنون کے لقب سے پکارتے تھے اور ایک دوسرے کو کہتے تھے:

"ھل ندلکم علی رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید افتری علی اللہ کذباً ام بہ جنۃ" (سورہ سبا آیت ۷،۸)

...... کیا ہم تمہیں ایک ایسے آدمی کا پتہ بتائیں جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم مکمل طور پر پارہ پارہ ہو جاؤ گے تو بلاشبہ تم نئی خلقت پاؤ گے؟ اس نے اللہ پر جھوٹ، بہتان باندھا ہے یا اسے جنون لاحق ہے؟

جی ہاں اس روز جہالت اور افکار کی تنگ نظری کی وجہ سے موت کے بعد کسی جہان پر عقیدہ اور مردوں کا زندہ ہونا ایک قسم کا جنون یا خدا پر تہمت محسوب ہوتا تھا اور بے جان مادہ (وہ جسم جو مرنے کے بعد مٹی ہو چکا ہو) سے چشمۂ حیات کے جاری [illegible]

لیکن جالب بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کے انکار کا مختلف دلائل کے ساتھ مقابلہ کیا ہے کہ عام لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور بڑے بڑے صاحبان نظر بھی غرض یہ کہ ہر کوئی اپنی فکری استطاعت کے مطابق ان سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

اگرچہ ان تمام قرآنی دلائل کی تشریح کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے لیکن ہم ان دلائل کے کچھ حصوں کو یہاں پر بیان کرتے ہیں:

۱) کبھی قرآن انہیں کہتا ہے کہ تم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے روزانہ کی زندگی میں معاد کے مختلف مناظر دیکھتے ہو کہ کسطرح بعض موجودات مرتے ہیں اور پھر زندہ ہوتے ہیں پھر بھی معاد کے مسئلہ میں شک وتردید کا شکار ہو؟

"واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحاباً فسقناہ الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتھا کذلک النشور"

اور اللہ ہی ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پھر ہم اسے ایک اجاڑ شہر کی طرف لے جاتے ہیں پھر ہم اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کردیتے ہیں اسی طرح (قیامت کے دن) اٹھنا ہوگا (سورہ فاطر آیت ۹)

موسم سرما میں طبیعت کے رخ پر نظر ڈالیں تو ہر جگہ موت کی بو محسوس ہوگی درخت پتوں، پھولوں اور پھلوں سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں بے حرکت خشک لکڑیاں اپنی جگہ پر باقی رہ جاتیں ہیں نہ کوئی پھول مسکراتا ہے، نہ کوئی کلی کھلتی ہے نہ میدانوں اور پہاڑوں میں زندگی کی حرارت نظر آتی ہے۔

جیسے جیسے موسم بہار آتا ہے ہوا میں ملائمت پیدا ہو جاتی ہے بارش کے حیات بخش

قطرات نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں ایک دفعہ طبیعت کروٹ بدلتی ہے پودے اگنے شروع ہو جاتے ہیں درخت پتے نکالتے ہیں پھول اور کلیاں نکلنا شروع ہو جاتیں ہیں پرندے درختوں کی شاخوں پر پھدکنا شروع ہو جاتے ہیں اور ہر طرف ایک محشر کا شور بپا ہو جاتا ہے۔

اگر موت کے بعد زندگی کا کوئی مفہوم نہ ہوتا تو ہم ہر سال یہ منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے، اگر موت کے بعد زندگی ایک ناممکن یا جنون آمیز بات ہوتی تو یہ چیز محسوس صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے بار بار نہ آتی۔

آخر کیا فرق ہے زمین کے مردہ ہونے کے بعد زندہ ہونے میں اور انسان کے مرنے کے بعد زندہ ہونے میں؟

۲) کبھی قرآن انکا ہاتھ پکڑے ہوئے آغاز تخلیق کے مراحل کی طرف لے جاتا ہے اور سب سے پہلی تخلیق کی یاد دلاتا ہے اس صحرائی بدو عرب کو جو پوسیدہ ہڈیوں کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہوئے پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور پکار کر کہتا ہے اے محمدؐ! کون قادر ہے کہ اس پوسیدہ ہڈی کو زندہ کرے؟ مجھے بتاؤ کون یہ کر سکتا ہے؟ وہ یہ گمان کرتا تھا کہ اس کے پاس مسئلہ معاد کے خلاف دندان شکن دلیل ہے، قرآن پیغمبر کو حکم دیتا ہے:

"قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ"

(سورہ یس آیت ۷۹)

کہیے وہی اسے زندہ کرے گا جس نے اس (بے جان مادہ) کو (اسی پانی اور مٹی سے) شروع میں خلق کیا۔

کسی چیز کو ابتداء میں پیدا کرنے اور دوبارہ پیدا کرنے میں کیا فرق ہے؟

لھذا دوسری آیات میں ایک چھوٹے اور پر معنی جملہ میں یوں فرماتا ہے:

"کما بدانا اول خلق نعیدہ" (سورۂ انبیاء آیت ۱۰۳)

"جسطرح ہم نے شروع میں پیدا کیا اسی طرح پھر لوٹا دیں گے۔

۳) کبھی قرآن پروردگار کی عظیم قدرت کو زمین وآسمان کی خلقت کے حوالے سے یاد کرواتا ہے کہ: آیا وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کرے؟ ہاں (وہ اس کام پر قادر ہے) اور وہ پیدا کرنے والا آگاہ ہے، وہ جب بھی کسی چیز کے بارے میں ارادہ کرتا ہے اسے حکم دیتا ہے ہوجا، وہ ہوجاتی ہے (سورہ یس آیات ۸۲،۸۱)۔

ان مسائل میں تردید کا شکار ایسے افراد تھے کہ جنکی فکر کی وسعت انکے چھوٹے سے معمولی گھر کے احاطہ سے زیادہ نہیں تھی، وگرنہ وہ جان لیتے کہ دوبارہ پیدا ہونا آغازِ خلقت (پہلی دفعہ پیدا ہونے) سے زیادہ آسان ہے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا ایسے خدا کی قدرت کے سامنے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔

۴) قرآن کبھی موت کے بعد زندگی کی طاقتوں کو انکی نگاہوں میں مجسم کرتا ہے اور فرماتا ہے "دیکھو اس پروردگار کو جس نے سرسبز درخت اور شجرہ اخضر سے آگ کو خلق کیا وہ قادر ہے کہ انسانوں کو موت کے بعد زندہ کرے"

"الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منه توقدون"

وہی ہے جس نے تمھارے لیئے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس سے آگ سلگاتے ہو (سورہ یس آیت ۸۰)

جب ہم قرآن مجید کی اس عجیب وغریب تعبیر میں دقت کرتے ہیں اور جدید علوم سے مدد لیتے ہیں تو آج کا علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ: جب ہم کسی درخت کی خشک لکڑی کو جلاتے ہیں اور اس سے آگ اور حرارت حاصل کرتے ہیں تو یہ حرارت اور گرمی وہی سورج کی شعاعیں، حرارت اور انرجی (Energie) ہے کہ جو اس طویل عرصے میں وہاں ذخیرہ ہوتی رہی، ہم نے سمجھ لیا کہ وہ شعاع اور حرارت ختم ہو چکی ہے لیکن آج جب ہم لکڑی کو جلاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ حرارت نئے سرے سے جان حاصل کر رہی ہے اور زندگی کا ایک نیا لباس پہن لیتی ہے۔ آیا اس خدا کیلئے کہ جو یہ قدرت رکھتا ہے کہ سالوں کی کئی دھائیوں سے سورج کی شعاعوں اور حرارت کو ایک درخت کے جسم میں ذخیرہ کرے اور ایک لمحہ میں اس تمام حرارت کو اس جسم سے باہر لے آئے تو کیا اسکے لئے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا مشکل کام ہے؟

بہر حال ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن نے کیسے روشن اور استدلالی منطق سے ایسے لوگوں کو دندان شکن جواب دیا ہے کہ جنہوں نے مسئلہ معاد پر شک وتردید کا اظہار کیا اور اسکا دعوی کرنے والوں کو دیوانہ سمجھا اور قرآن مجید نے واضح انداز سے معاد کے امکان کو ثابت کیا ہے کہ جسکا کچھ حصہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) مشرکین مسئلہ معاد پر حیرت کا اظہار کیوں کرتے تھے؟

۲) ہم نباتات کی دنیا میں معاد کے منظر کو ہر سال اپنی انکھوں سے دیکھتے ہیں؟ وضاحت کریں۔

۳) قرآن مجید اپنی بعض آیات میں جنین کی زندگی کے مراحل کو معاد پر دلیل قرار دیتا ہے اسکی وجہ کیا ہے؟

۴) موت کے بعد زندگی کی طاقتیں کونسی ہیں؟

۵) قرآن نے "**الشجر الاخضر**" (سبز درخت) سے استدلال کیوں کیا ہے؟

ساتواں سبق

معاد اور فلسفہ تخلیق

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ: اللہ تعالی نے ہمیں کس لیے پیدا کیا ہے؟ کبھی اس سے بڑھ کر کہتے ہیں کہ: بالآخر اس وسیع و عریض جہان کی تخلیق کا فلسفہ کیا ہے؟

کسان اور باغبان درخت کو پھل کیلئے اگاتا ہے اور زمین کو فصل کیلئے تیار کرتا ہے اور بیج بوتا ہے تو تخلیق کے باغبان نے ہمیں کس مقصد کیلئے پیدا کیا ہے؟

آیا خدا کے پاس کوئی کمی تھی کہ جسکا جبران ہمیں تخلیق فرما کر کیا ہے؟ تو اس صورت میں وہ محتاج کہلائے گا احتیاج رکھنا پروردگار کے مقام اور اسکے لامحدود وجود کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

اس سوال کے جواب میں بہت سی باتیں ہیں لیکن چند جملوں میں اس واضح جواب کا خلاصہ کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اللہ تعالی کی صفات کا اپنی ذات کے ساتھ قیاس کرتے ہیں ہم چونکہ محدود سے وجود کے مالک ہیں لھذا جو بھی کرتے ہیں اپنی کمی کو پورا کرنے کیلئے کرتے ہیں (مثلا) درس پڑھتے ہیں کہ علم کی کمی پوری ہو، کام کرتے ہیں کہ مالی پریشانی ختم ہو، علاج و معالجہ کرواتے ہیں کہ صحت و سلامتی حاصل ہو۔

لیکن پروردگار کی طرف سے کہ جو ہر جہت سے لامحدود ہے کوئی کام ہوتا ہے تو ہم اس کام کے ہدف کو اسکی ذات سے قطع نظر دوسرے موجودات میں ڈھونڈیں گے، وہ اس لیے پیدا نہیں کرتا کہ اسے فائدہ حاصل ہو بلکہ اسکا مقصد یہ ہے کہ اپنے بندوں پر اپنی بے شمار نعمتوں کو نازل کرے۔

وہ بے انتہا روشنیوں سے روشن آفتاب ہے کہ جو بغیر کسی ضرورت اور محتاجی کے اپنا نور پھیلا رہا ہے تاکہ سب اسکے نورانی وجود سے فائدہ اٹھائیں یہ اس لامحدود اور پر فیض ذات کا کرم ہے کہ وہ مخلوقات کا ہاتھ پکڑے انہیں کمال کی راہوں میں آگے سے آگے لے جا رہی ہے۔

عدم سے جہان رنگ وبو میں آنا بذات خود راہ کمال میں پہلا قدم تھا، پیغمبروں کا آنا، آسمانی کتابوں کا نزول اور قوانین شریعت کی تعیین اور اجراء یہ سب کے سب ہماری راہ کمال کے مراحل شمار ہوتے ہیں۔

یہ جہان بہت بڑی یونیورسٹی ہے اور ہم اسکے طالب علم!

یہ جہان تیار شدہ کھیت ہے اور ہم اسکے کاشت کار!

یہ جہان منفعت بھری منڈی ہے اور ہم اسکے تاجر

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم انسان کی خلقت کیلئے کسی بھی ہدف کے قائل نہ ہوں؟

حالانکہ جب ہم اردگرد بغور نگاہ کریں اور موجودات کے ذرہ ذرہ کی چھان بین کریں تو دیکھیں گے کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی ہدف لیے ہوئے ہے۔

ہمارے بدن کی عجیب وغریب ورکشاپ میں کوئی چیز بے ہدف نہیں ہے حتی کہ ہماری آنکھوں کی پلکیں اور ہمارے پاؤں کے درمیان خلا بھی! آخر کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے

وجود کی عمارت کا ہر ذرہ ہدف کے تحت ہو لیکن ہمارا مکمل وجود بے ہدف ہو؟!

اپنے وجود سے باہر آئیں اس عظیم کائنات پر نظر دوڑائیں، ہر چیز کو اپنے اپنے جدا ہدف کے ساتھ دیکھیں گے سورج کی حرارت ایک ہدف کے تحت ہے، برسات کی بارش ایک ہدف کے تحت ہے ہوا کا مخصوص آمیزہ ایک ہدف کے ساتھ ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ یہ مکمل جہان بغیر کسی ہدف کے ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وسیع وعریض جہان کے دل میں ہدف کی وضاحت کیلئے بہت بڑا بورڈ نصب ہے کہ کبھی اسکی وسعت کی وجہ سے ہم شروع میں اسے نہیں دیکھ پاتے اور اس پر یہ لکھا ہوا ہے "تربیت اور تکامل"۔

اب جب کہ اپنی تخلیق کے ہدف سے کچھ حد تک ہم آشنا ہو چکے ہیں تو بات یہ ہے کہ آیا دنیا کی یہ چندروزہ زندگی اپنی تمام تر مشکلات مصیبتوں اور ناکامیوں کے باوجود ہماری تخلیق کا ہدف قرار پا سکتی ہے؟ فرض کریں میں ساٹھ سال اس دنیا میں زندگی گزارتا ہوں ہر روز صبح سے شام تک روزی کی تلاش میں کام کرتا ہوں اور رات کو تھکا ماندہ گھر کو لوٹتا ہوں جسکے نتیجے میں اپنی اس طولانی عمر میں چند ٹن غذا اور پانی صرف کرتا ہوں بہت ہی زحمتوں اور مشکلات سے ایک گھر بناتا ہوں اور پھر اس کو اسی جگہ چھوڑ کر اس جہان سے چلا جاتا ہوں آیا یہ ہدف اسقدر اہم تھا کہ "مجھے درد ورنج سے پر زندگی کی طرف بھیجا گیا" جس طرح اگر کوئی انجینئر کسی صحرا کے وسط میں عظیم الشان عمارت بنائے سالہا سال اسکی تکمیل و تنظیم میں کوشش کرتا رہے اسکے لیے ہر ضرورت کی چیز فراہم کرے اور جب اس سے سوال کیا جائے کہ تمہارا اس عمارت کو بنانے کا مقصد کیا ہے؟

وہ کہے کہ میرا ہدف یہ ہے کہ جب تک یہ عمارت قائم رہے کوئی ادھر سے گذرے اور

اس میں ایک ساعت آرام کرے!

کیا سب تعجب کرتے ہوئے یہ نہیں کہیں گے کہ گزرنے والے مسافر کے ایک ساعت کے آرام کیلئے اس قدر زحمتوں اور محنت کی ضرورت نہیں ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو موت کے بعد زندگی پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس دنیا کی زندگی کو فضول سمجھتے ہیں اور ایسے کلمات مادہ پرست لوگوں (خدا پر ایمان نہ رکھنے والے) کی گفتگو میں بکثرت پائے جاتے ہیں کہ "یہ جہان بے ہدف ہے"!

حتی کہ ان میں سے کچھ لوگ خودکشی کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اس یکساں مادی زندگی سے جو کہ انکے خیال میں بے ہدف ہے تھک جاتے ہیں۔

وہ چیز جو اس زندگی کو باہدف اور بامقصد بناتی ہے اور اسے معقول اور باحکمت قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ "یہ زندگی کسی اور جہان کا مقدمہ (یعنی ابتدائی مرحلہ) ہو اور اس زندگی کی تمام مشکلات کو برداشت کرنا اور یہ سب زحمات ایک ابدی زندگی کے حصول کی خاطر ہو۔

یہاں اسی جالب سی مثال کا ذکر مناسب ہے کہ جو پہلے ذکر کی جا چکی ہے وہ یہ کہ اگر شکم مادر میں کسی ایسے جنین سے کہا جائے جو کافی حد تک عقل و شعور کا حامل ہو: کہ یہ زندگی جو تم گزار رہے ہو اسکے بعد کچھ نہیں ہے،

یقیناً وہ اپنی زندگی پر اعتراض کرے گا اور کہے گا: "اسکا کیا مطلب ہے کہ میں اسی جگہ پہ قید رہوں؟ خون میری غذا ہو اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ایک گوشہ میں پڑا رہوں اور اسکے بعد کچھ بھی نہ ہو؟ خالق کا میری اس تخلیق سے کیا ہدف ہے؟!" لیکن اگر اسے اطمینان دلایا جائے کہ یہ چند مہینے ایک عارضی مرحلہ ہے اور دنیا کی لمبی زندگی گزارنے کیلئے

تیار ہونے کا زمانہ ہے ایک ایسے جہان میں جانے کیلئے جو اس جنین کے جہان سے وسیع، روشن اور باعظمت ہے اس سے بڑھ کر وہاں عنایات اور نعمات ہیں تو اس وقت وہ قانع ہو جائیگا کہ یہ زمانۂ جنین ایک قابل توجہ ہدف کیلئے ہے لھذا اس ہدف کی خاطر اسکے لئے یہ سب کچھ قابل برداشت ہوگا۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"و لقد علمتم النشاۃ الاولی فلو لا تذ کرون"

(سورہ واقعہ آیت ۶۲)

اور بتحقیق پہلی پیدائش کو تم جان چکے ہو پھر تم عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ: یہ جہان اپنے تمام وجود کے ساتھ پکار رہا ہے کہ اسکے بعد ایک اور جہان ہے ورنہ وہ لغو، فضول اور بے معنی ہو کر رہ جائیگا یہ بات قرآن مجید کی زبان سے سنیے کہ فرما رہا ہے:

"افحسبتم انما خلقناکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون" (سورہ مومنون آیت ۱۹۵)

کیا تم گمان کرتے ہو کہ تمہیں ہم نے فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے؟

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر "معاد" جسکو قرآن نے خدا کی طرف لوٹنے سے تعبیر کیا ہے" نہ ہو تو انسان کی خلقت بالکل فضول ہے نتیجہ یہ ہے کہ فلسفۂ خلقت صاف صاف کہہ رہا ہے کہ: اس جہان کے بعد ضروری ہے کہ ایک اور جہان ہو۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) پروردگار کی صفات کا مخلوق کی صفات کے ساتھ مقایسہ کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

۲) ہماری خلقت کا ہدف کیا تھا؟

۳) آیا اس جہان کی زندگی انسان کی خلقت کا ہدف ہو سکتی ہے؟

۴) زمانہ جنین کی زندگی اور اس جہان کی زندگی کا مقایسہ ہمیں کیا سکھاتا ہے؟

۵) قرآن اس جہان کی خلقت سے آخرت کے وجود پر کیسے استدلال کرتا ہے؟

آٹھواں سبق

روح کی بقا موت کے بعد زندگی کی علامت

کوئی بھی نہیں جانتا کہ انسان نے کس زمانے سے ''روح'' کے وجود کے بارے میں فکر شروع کی۔

صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ: انسان نے شروع ہی سے اپنے اور اس جہان کے دوسرے موجودات کے درمیان فرق دیکھا ہے، اسکے اور پتھر، لکڑی، پہاڑ اور صحرا کے درمیان فرق اور اسکے اور دوسرے حیوانات کے درمیان فرق۔

انسان نیند کی حالت کو دیکھ چکا ہے اور اسی طرح موت کی حالت کو بھی وہ دیکھ رہا ہے کہ سونے یا مرنے کی حالت میں جسم و مادہ میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوتی ہے یہیں سے وہ سمجھتا ہے کہ جسم کے علاوہ ایک اور گوہر بھی اسکے اختیار میں ہے (کہ جو تبدیل نہیں ہوتا) نیز یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ وہ حیوانات سے مختلف ہے، کیونکہ وہ اپنے ارادہ میں آزاد اور با اختیار ہے جبکہ حیوانات اپنی حرکات میں فطری وغریزہ حیوانی کی وجہ سے مجبور ہیں۔

بالخصوص خواب کی حالت میں مختلف مناظر دیکھنا جبکہ بدن کے تمام اعضاء ساکت ہوتے ہیں یہ اس بات پر شاہد ہے کہ ایک اور مخفی طاقت اسکے وجود پر مسلط ہے کہ جسے ''روح'' کہا جاتا ہے۔

جب سے جہان بشر کے مفکرین نے علم فلسفہ کی بنیاد رکھی ہے انہوں نے ''روح'' کو دوسرے فلسفی مسائل کے ساتھ ایک اہم مسئلہ بیان کیا ہے، یہانتک کہ بقول بعض مفکرین اسلامی اب تک روح کی حقیقت اور اسکے متعلق دوسرے مسائل کے حوالے سے تقریباً'' ایک ہزار اقوال ونظریات'' سامنے آچکے ہیں اگر چہ یہاں بحث بہت زیادہ ہے لیکن اہم ترین چیز جسکا جاننا ہماری نظر میں ضروری ہے اس سوال کا جواب ہے کہ:

آیا روح مادی ہے یا غیر مادی؟ یایوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ: روح ایک مستقل چیز ہے یا دماغ اور اعصاب کے سلسلہ کے مادی اور کیمیائی خواص میں سے ہے؟

مادی مکاتب کے فلاسفہ کا ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ روح اور اسکے متعلق اشیاء مادی ہیں اور دماغ کے خلیات (cells) کے خواص میں سے ہیں اور جب انسان مرجاتا ہے تو روح بھی اسی طرح ختم ہوجاتی ہے جسطرح ایک گھڑی کو جب ہتھوڑی کی ایک ضرب سے توڑ دیا جائے تو فوراً ہی اسکی وقت بتانے والی حرکت بھی ختم ہوجاتی ہے!

انکے مدمقابل الٰہی فلاسفہ اور حتی کہ بعض مادی مکاتب کے حامل فلاسفہ بھی روح کی حقیقت اور جاودانی کے قائل ہیں اور انکا عقیدہ ہے کہ جسم کی موت سے روح نہیں مرتی بلکہ وہ اسی طرح زندگی کی راہوں پر گامزن رہتی ہے۔

روح کی جاودانی اور اسکے استقلال کے اثبات کیلئے بہت سی دقیق دلیلیں قائم کی گئی ہیں کہ ہم بطور اختصار ان میں سے بعض واضح دلیلوں کو سادہ اور روان عبارتوں سے اپنے عزیز جوانوں کیلئے ذکر کرتے ہیں تا کہ وہ خوب آگاہ ہوسکیں۔

۱) ایک بڑا جہان ایک محدود سی چھوٹی جگہ پر نہیں سماسکتا۔ فرض کریں آپ ایک بہت بڑے سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں کہ جسکے اردگرد سر بفلک پہاڑ تن کر کھڑے ہیں سمندر کی

بڑی بڑی امواج خشم وقہر سے گرجتی ہوئیں بار بار ساحلی چٹانوں سے ٹکرا رہی ہیں اور اسی حالت غضب وشدت میں سمندر کی طرف پلٹ جاتی ہیں۔ پہاڑی سلسلہ میں پھیلی ہوئیں عظیم الجثہ چٹانیں بخوبی بتا رہی ہیں کہ پہاڑوں کے اوپر کیا قیامت سا منظر برپا ہے، تا حد نگاہ نیلگوں آسمان کا خیمہ ان پہاڑوں اور سمندر پر لگا ہوا ہے اور رات کے وقت اسکی عظمت وشکوہ کے جلوے دیکھنے والے ہوتے ہیں۔

ہم ایک لحہ اس منظر کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں اسی منظر کو اسی شان وشوکت سے دوبارہ مجسم کرتے ہیں۔

بلاشبہ یہ اتنا بڑا ذہنی نقشہ اور یہ سب مناظر اسی قدر عظیم جگہ میں سمائیں گے ایسا ممکن نہیں کہ یہ دماغ کے محدود سے خلیات میں بند ہوجائیں اگر ایسا ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہت بڑے نقشے کو ایک معمولی سے نقطہ میں بنا دیا جائے (حالانکہ یہ محال ہے تو ذہن میں کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ) ہم بلاشبہ اس بہت بڑے منظر کو اسی عظمت وشکوہ کے ساتھ اپنے ذہن میں محسوس کررہے ہیں۔

یہیں سے معلوم ہو رہا ہے کہ جسم اور مغزی خلیات کے علاوہ ہم اپنے وجود میں ایک ایسا گوہر بھی رکھتے ہیں کہ جو ہر قسم کے نقشہ اور منظر کو ہر مقدار کے ساتھ اپنے اندر منعکس کرسکتا ہے لامحالہ یہ گوہر جہان مادہ سے ماوراء ہوگا چونکہ جہان مادہ میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔

۲) روح میں بیرونی دنیا کے انعکاس جیسی خصوصیت:

ہم اپنے وجود میں بہت سے فیزیکلی اور کیمیائی خواص پاتے ہیں مثلاً دل ومعدہ میں

مختلف حرکات یہ ایک فیزیکلی عمل ہے جبکہ پیٹ میں جانے والی غذا پر مختلف قسم کے مواد کا ترشح یہ ایک کیمیائی عمل ہے اس قسم کی مثالیں ہمارے پورے جسم میں فراواں ہیں۔

اگر فرضاً روح خیالات اور فکر سب کے سب مادی اور معنوی سلز کی فیزیکلی اور کیمیائی خصوصیات میں سے ہیں تو پھر ان میں اور دوسری جسمانی خصوصیات میں اتنا بڑا فرق کیوں ہے؟

ہماری فکر، ہمارا خیال اور ہماری روح ہمیں بیرونی دنیا سے مربوط کرتی ہیں جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے ہمیں اس سے بخوبی آگاہ کرتی ہیں جبکہ معدہ کے کیمیائی مواد اور فیزیکلی حرکات، آنکھ، زبان اور ہمارے دل کی یہ کیفیت نہیں ہے۔

ایک اور انداز سے اس مطلب کو واضح کرتے ہیں کہ ہم اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ بیرونی دنیا سے ہم اپنے وجود کے ساتھ مربوط ہیں اور بیرونی دنیا کے مسائل سے آگاہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیا بیرونی دنیا ہمارے اندر داخل ہوئی ہے؟ یقیناً نہیں تو پھر اصل مسئلہ کیا ہے؟

یقیناً بیرونی جہان کا منظر ہمارے پاس آتا ہے جس سے روح میں پائی جانے والی انعکاس جیسی خصوصیت کی وجہ سے ہم بخوبی آگاہ ہو جاتے ہیں اور یہ انعکاس کی خصوصیت ہمارے جسم کے کسی بھی فیزیکلی یا کیمیائی حصہ میں نہیں ہے (دقت کریں)

پھر ایک اور طرح سے وضاحت کرتے ہیں: بیرونی دنیا کے موجودات سے باخبر ہونے کیلئے ان پر ایک قسم کا تسلط ضروری ہے، یہ کام مغزی خلیات یا سلز کا نہیں ہے مغزی خلیات یا سلز بدن کے دوسرے سلز کی مانند صرف بیرونی دنیا کے عمل و ردعمل سے متاثر ہوتے ہیں۔

اس خصوصیت سے واضح ہو رہا ہے کہ بدن کی فیزیکلی اور کیمیائی تبدیلیوں کے علاوہ یہاں ایک اور حقیقت بھی موجود ہے جو ہمارے وجود سے باہر کی دنیا پر ہمارا تسلط برقرار کرتی ہے اور ہم ان سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور یہ حقیقت ''روح'' کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جو اس مادی جہان اور اسکی خصوصیات سے بڑھ کر ہے۔

روح کے حقیقی ہونے اور مستقل ہونے پر تجرباتی دلائل

خوش قسمتی سے آج مفکرین جہان نے مختلف علمی اور تجرباتی راہوں سے روح کی مستقل اور حقیقی حیثیت کو ثابت کر دیا ہے اور ان لوگوں کو مضبوط دندان شکن جواب دیا ہے جو روح کی مستقل حیثیت کے منکر ہیں یا اسے مادی خواص میں سے سمجھتے ہیں

۱) مغناطیسی نیند (Hypnotism - or - magnetism) ان محکم دلائل میں سے ہے جو بہت زیادہ تجربات کے بعد سامنے آئے ہیں اور بہت سے لوگوں نے اس چیز کو دیکھا ہے اور جن لوگوں نے اسے نہیں دیکھا ان کیلئے تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ:

کچھ افراد مختلف علمی طریقوں سے دوسروں کے ذریعے نیند میں چلے جاتے ہیں نیند لانے والا ''عامل'' کہلاتا ہے اور وہ جو نیند میں چلا جاتا ہے اسے ''معمول'' کہا جاتا ہے اسمیں تلقین، فکری ارتکاز اور آنکھ کی مغناطیسی قوت اور دوسرے ذرائع سے ''معمول'' کو گہری نیند میں لیجایا جاتا ہے لیکن یہ کوئی معمول کے مطابق نیند نہیں ہوتی بلکہ ایسی نیند ہوتی ہے کہ جس میں سونے والے کے ساتھ رابطہ برقرار رکھا جاسکتا ہے اس سے سوال و جواب ہوسکتا ہے۔

اسی حالت میں اسکی روح کو مختلف جگہ بھیجا جاتا ہے اور وہ کبھی نئی نئی خبریں لاتی ہے اور ایسے مسائل کے حوالے سے ہمیں مطلع کرتی ہے کہ جنکے بارے میں ہم عام حالات میں مطلع نہیں ہوتے۔

کبھی وہ اسی مغناطیسی نیند میں اپنی مادری زبان سے ہٹ کر ایسی زبان میں گفتگو کرتا ہے کہ جس سے وہ بالکل آشنا نہیں ہوتا۔

کبھی وہ اسی حالت میں ریاضی کے پیچیدہ ترین سوال حل کرتا ہے۔

کبھی وہ ایسے صندوق میں پڑی ہوئی الواح پر لکھتا ہے کہ جسکے دروازے مضبوطی سے بند ہیں اور یہاں تک کہ کبھی یہ ارواح دھندلی صورتوں اور روشن سایوں کی مانند مختلف پروگراموں میں ظاہر ہوتی ہیں کہ اسکی تشریح ہم نے کتاب ''عود ارواح'' میں کی ہے۔

۲) ''اسپری تیسم'' (spiritisms) یا موت کے بعد ''ارواح سے ارتباط'' روح کی حقیقت اور اسکی مستقل حیثیت پر ایک اور دلیل ہے۔

آج بھی ایسے کام کرنے والے لوگوں کی پوری دنیا میں تنظیمیں ہیں کہ مشہور مصری دانشور ''فرید وجدی'' کے بقول تقریباً تین سو رسالے اور اخبار ان تنظیموں کی طرف سے پوری دنیا میں نشر ہوتے ہیں دنیا کی بڑی بڑی مختلف شخصیات ان کے پروگراموں میں شرکت کرتی ہیں اور انکی موجودگی میں ارواح سے رابطہ کیا جاتا ہے اور معمول سے ہٹ کر (خارق العادت) عجیب وغریب کام کیے جاتے ہیں۔

اگر چہ بہت سے فریب کار جو کہ در حقیقت ان مسائل (روح سے رابطہ) سے لاعلم ہوتے ہیں لیکن لوگوں کو فریب دینے کیلئے اس قسم کے دعوے کرتے ہیں کہ وہ روح سے رابطہ کر سکتے ہیں اور اس حوالے سے بہت غلط فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس قسم کا فریب اور

غلط فائدہ اٹھانا اس موجود حقیقت کو نہیں چھپا سکتا کہ جسکا بڑے بڑے محققین نے اعتراف کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''ارواح سے رابطہ کرنا ممکن ہے''(۱)

یہ سب کچھ انسان کی روح کی حقیقت اور اسکی مستقل حیثیت اور اس کی موت کے بعد باقی رہنے پر دلیل ہے اور ساتھ یہ کہ یہ موت کے بعد زندگی اور معاد کی طرف بھی ایک موثر قدم ہے۔

۳) وہ خواب جو ہم دیکھتے ہیں اور وہ مناظر جو عالم خواب میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں یہ کبھی آنے والے حادثات کی خبر دیتے ہیں اور کبھی یہ بہت سے پوشیدہ مسائل کو بھی آشکار کرتے ہیں کہ جنھیں ہم اتفاقیہ نہیں کہہ سکتے یہ چیز بھی روح کی حقیقت پر ایک اور دلیل ہے۔

اکثر افراد کو اپنی زندگی میں سچے خوابوں کے حوالے سے واقعات پیش آتے ہیں اور وہ سنتے ہیں کہ کس طرح وہ خواب جو فلاں دوست یا عزیز کو آیا تھا کچھ مدت کے بعد کم وبیش سچ ثابت ہوا یہ چیز واضح کررہی ہے کہ انسان کی روح کا کس طرح دوسرے جہانوں سے خواب کی حالت میں رابطہ ہوتا ہے اور وہ پیش آنے والے حادثات کو دیکھتی ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر یہ سب کچھ واضح کررہا ہے کہ روح نہ مادی ہے اور نہ وہ دماغ کی فیزیکلی اور کیمیائی خصوصیت ہے بلکہ ماوراء طبیعت ایک حقیقت ہے جو بدن کی موت سے ختم نہیں ہوتی یہ چیز خود ہی مسئلہ معاد اور موت کے بعد جہان کے اثبات کی راہ کو ہموار کرتی ہے۔

---

۱) اس چیز کی مزید وضاحت کیلئے کتاب ''عود ارواح'' اور کتاب ''معاد وجہان پس از مرگ'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) روح کے حوالے سے الٰہی فلاسفہ اور مادی فلاسفہ کے نظریات میں کیا فرق ہے؟

۲) ''بڑی چیز کا چھوٹی چیز میں سمانا'' کہ جو روح کی حقیقت پر ایک دلیل ہے اس سے کیا مراد ہے؟

۳) آپ مقناطیسی نیند کے حوالے سے کیا جانتے ہو؟

۴) روح سے رابطہ سے کیا مراد ہے؟

۵) سچے خواب روح کی حقیقت اور اسکی مستقل حیثیت پر کس طرح دلیل ہے؟

نواں درس

جسمانی اور روحانی معاد

معاد کی بحث میں اٹھائے جانے والے اہم سوالات میں سے ایک سوال یہ ہے کہ آیا معاد میں صرف ''روحانی'' جنبہ ہے یا اس جہان میں انسان کا بدن اور جسم بھی دوبارہ لوٹ آئے گا اور انسان اسی روح اور جسم کے ساتھ کہ جو اس دنیا میں ہے وہاں بھی ایک اچھی اور بلند حیثیت کے ساتھ اپنی نئی زندگی کو شروع کرے گا؟

کچھ سابقہ فلسفی حضرات صرف معاد روحانی کے قائل تھے اور جسم کو ایسا وسیلہ یا سواری سمجھتے تھے جو صرف اس دنیا میں انسان کے ساتھ ہے اور موت کے بعد انسان اسکا محتاج نہیں رہے گا اور اسے چھوڑ کر عالم ارواح کی طرف چلا جائے گا لیکن عالم اسلام کے بزرگ علماء اور اکثر فلاسفہ کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد میں دونوں پہلو ہیں یعنی ''روحانی'' اور جسمانی۔

یہ بات درست ہے کہ یہ جسم خاک بن جائیگا اور یہ خاک بکھر کر کہاں کی کہاں چلی جائیگی، لیکن وہ قادر اور عالم ذات روز قیامت ان تمام ذرات کو جمع کرے گی اور انہیں دوبارہ نئی زندگی کا لباس پہنائے گی وہ اس چیز کو ''معاد جسمانی'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کیونکہ روز قیامت روح کا لوٹنا تو ایک ثابت شدہ بات ہے بحث صرف جسم کے لوٹنے کی

حوالے سے ہے اسی لیے انہوں نے اپنے عقیدے کو جسمانی معاد کا نام دیا ہے۔

بہر حال وہ تمام آیات قرآن جو معاد کے حوالے سے گفتگو کرتی ہیں "اگر چہ وہ بہت زیادہ اور مختلف قسم کی ہیں" وہ معاد جسمانی کو بیان کرتی ہیں۔

جسمانی معاد پر قرآنی شواہد

پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک بدو عرب فرسودہ ہڈی کو لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ کون اسکو زندہ کر سکتا ہے؟

پیغمبر اکرمؐ حکم پروردگار کے مطابق جواب فرماتے ہیں: وہی جس نے اسے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا وہی جس نے آسمان اور زمین کی تخلیق کی اور سر سبز درخت سے آگ باہر نکالتا ہے جیسا کہ سورہ "یس" کے آخر میں یہ آیات موجود ہیں۔

قران ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "تم قیامت میں قبروں سے نکلو گے" (سورہ یس آیت ۵۱، اور سورہ قمر آیت ۷) اور ہم یہ جانتے ہیں کہ قبریں خاک ہو جانے والے اجسام کی جگہیں ہیں ارواح کی جگہیں نہیں ہیں اصولی طور پر معاد کے منکرین کی حیرت کا مرکز یہی تھا کہ جو وہ کہتے ہیں: "کس طرح جبکہ ہم خاک ہو چکے ہونگے اور ہماری خاک بکھر جائیگی دوبارہ ہم زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے؟

"و قالوا ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید" (سورہ سجدہ آیت ۱۰)

اور قرآن انہیں جواب دے رہا ہے کہ جسطرح پروردگار اس پر قادر ہے کہ وہ کسی چیز کو پہلی دفعہ پیدا کرے وہ اس پر بھی قادر ہے۔ کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ اللہ خلقت کی

ابتدا کیسے کرتا ہے پھر اسکا اعادہ کرتا ہے یقیناً اللہ کیلئے یہ (اعادہ) زیادہ آسان ہے (سورہ عنکبوت ۱۹)

کوئی جاہل عرب کہہ رہا تھا "کس طرح یہ مرد تمہیں وعدہ دے رہا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور خاک اور ہڈی بن جاؤ گے تو پھر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹائے جاؤ گے" (سورہ مومنون آیت ۳۵)

یہ سب قرآنی تعبیرات اور دوسری آیات واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے ہر جگہ جسمانی معاد کا مسئلہ مورد بحث قرار دیا تھا اور تنگ نظر مشرکین کیلئے باعث حیرت بھی یہی بات تھی اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے قرآن معاد جسمانی کی وضاحت کے حوالے سے عالم نباتات اور اس قسم کے دوسرے عوالم کی مثالیں دیتا ہے اور پروردگار کی پہلی تخلیق اور اسکی قدرت کو بطور شاہد ذکر کرتا ہے۔

اسی لیے یہ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان ہو اور بہت ہی کم حد تک قرآن سے آگاہی رکھتا ہو اور پھر بھی جسمانی معاد کا انکار کرے کیونکہ جسمانی معاد کا انکار قرآن کی نظر میں خود معاد کے انکار کے مساوی ہے۔

عقلی شواہد

اس سے صرف نظر کریں تو عقل کہتی ہے کہ روح اور بدن باوجود مستقل حیثیتوں کے دو علیحدہ حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ آپس میں پیوند اور رابطہ رکھتی ہیں۔ دونوں کی اکٹھی نشوونما ہوتی ہے اکٹھے راہ کمال طے کرتے ہیں اسی طرح واضح سی بات ہے کہ ابدی زندگی گزارنے کیلئے بھی دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

اگر یہ دونوں زمانہ برزخ (دنیا وآخرت کا درمیانی عرصہ) میں کچھ مدت ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں تو یہ جدائی ہمیشہ کیلئے ممکن نہیں ہے جسطرح جسم روح کے بغیر ناقص ہے اسی طرح روح بھی جسم کے بغیر نقصان میں ہے روح حاکم اور عامل حرکت ہے اور بدن فرمانبردار اور وسیلہ حرکت ہے کوئی بھی حاکم اپنے فرمانبردار اور کوئی فنکار اپنے وسائل سے بے نیاز نہیں ہے۔

چونکہ روح روز قیامت اس جہان سے بڑھ کر اچھی وضعیت میں ہوگی تو بدن بھی اسی طرح راہ کمال طے کرتے ہوئے اسی مقام پر ہوگا اور یہ بھی ہوگا کہ انسان کا جسم روز قیامت پوسیدگی اور اس جہان کے دوسرے عیوب ونقائص سے پاک ہوگا۔

بہر حال جسم وروح ایک دوسرے کے ہمزاد اور ایک دوسرے کو مکمل کرنے والے ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ معاد میں صرف جنبہ روحانی ہو یا صرف جنبہ جسمانی یعنی جسم وروح کی خلقت کی کیفیت اور انکے آپس میں گہرے تعلق پر مطالعہ اس چیز پر واضح دلیل ہے کہ معاد میں دونوں پہلو موجود ہوں گے۔

دوسری طرف قانون عدالت بھی یہی کہتا ہے کہ: معاد دونوں اعتبار سے ہو اگر انسان نے گناہ کیا ہے تو اس روح وجسم کے ساتھ کیا ہے اور اگر نیکی کی ہے تو بھی اسی روح وجسم کیساتھ کی ہے اسی لیے جزا وسزا بھی اسی روح وجسم کیلئے ہو اگر یہ سزا وجزا صرف جسم یا صرف روح کیلئے ہو تو قانون عدالت کا اجراء نہیں ہوسکے ہوگا۔

معاد جسمانی کے حوالے سے سوالات

دانشور حضرات اس مقام پر متعدد سوالات کرتے ہیں کہ ان میں سے بعض کا ذکر ان

ابحاث کی تکمیل کیلئے ضروری ہے:

۱) علوم طبیعی کے محققین کی تحقیقات کے مطابق انسان کا بدن اسکے عرصہ حیات میں کئی دفعہ تبدیل ہوتا ہے بالکل اسی پانی کے حوض کی مانند کہ جسمیں ایک طرف سے پانی داخل ہو رہا ہے اور دوسری طرف سے آہستہ آہستہ نکل رہا ہے، واضح ہے کچھ دیر بعد اس حوض کا تمام پانی تبدیل ہو جائیگا۔

یہ صورت انسانی بدن کے حوالے سے احتمالاً ہر سات سال میں ایک دفعہ پیش آتی ہے تو اسی بنا پر ہم اپنے عرصہ زندگی میں کئی دفعہ تبدیل ہوتے ہیں! اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ ان تمام جسموں میں سے کونسا جسم (روز قیامت) لوٹ آئیگا؟

جواب میں کہیں گے: آخری جسم، جسطرح کہ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا کہ پروردگار انسانوں کو اسی پوسیدہ اور خاک ہوئی ہڈیوں سے نئی خلقت دے گا، تو اسکا مطلب یہی ہے کہ سب سے آخری بدن لوٹ آئیگا اسی طرح قبروں سے نکلنے سے مراد یہی ہے کہ آخری بدن کے ساتھ نکلیں گے۔

لیکن اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ آخری بدن ان تمام خواص کا حامل ہوگا جو ان تمام جسموں کے تھے جو عرصہ حیات انسانی میں بدلتے رہے ایک اور تعبیر کے ساتھ یوں کہیں گے کہ: وہ تمام بدن جو آہستہ آہستہ ختم ہوتے رہے وہ اپنی تمام خصوصیات اور آثار آنے والے بدن میں منتقل کرتے رہے اسی لیے یہ آخری بدن پچھلے تمام اجسام کی صفات کا وارث ہے لھذا قانون عدالت کے مطابق سزا وجزا کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲) بعض کا یہ کہنا ہے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے اور ہماری خاک کے ذرات نباتات کے اجزاء بن کر کسی اور انسان کے بدن کا جزء بن جائیں گے تو روز قیامت حکم خدا

کیا ہوگا؟ (یہ وہی بحث ہے جسے ہم فلسفہ وکلام کی ابحاث میں ''شبہہ آکل وماکول'' کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔

اگرچہ اس کے سوال کے جواب کیلئے بہت تفصیلی بحث کی ضرورت ہے لیکن ہم کوشش کرتے ہیں کہ ضرورت کی حدتک مختصر سی عبارت میں یہ بحث کریں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ: یہ طے ہے کہ وہ ذرات جو ایک انسان کے خاک شدہ بدن کے ہوں اور دوسرے انسان کے بدن کا جزء بن جائیں وہ واپس پہلے بدن کی طرف لوٹ جائیں گے (سابقہ آیات اسی چیز پر تفصیل سے شہادت دے رہی ہیں)

اگر کوئی مشکل یہاں باقی رہتی ہے تو وہ یہ کہ دوسرا بدن ناقص ہو جائیگا، لیکن یوں کہنا چاہیے کہ دوسرا بدن ناقص یا نامکمل نہیں ہوگا بلکہ چھوٹا ہو جائیگا چونکہ یہ ذرات اسکے تمام بدن میں بکھرے ہوئے تھے جب اس سے لے لیے گے تو وہ اس حساب سے کمزور اور چھوٹا ہو جائیگا لھذا نہ پہلا بدن ختم ہوگا اور نہ دوسرا بدن فقط یہ ہوگا کہ دوسرا بدن چھوٹا ہو جائیگا اور اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ روز قیامت تمام انسانی بدن تکامل پائیں گے انکے نقائص برطرف ہو جائیں گے بالکل اسی طرح جیسے ایک بچہ نشو نما پاتا ہے یا ایک زخمی انسان کا نئے سرے سے گوشت بنتا ہے جسکی وجہ سے اسکی شخصیت تباہ نہیں ہوتی لھذا قیامت کے روز نامکمل اور چھوٹے بدن بھی عالم کمال میں ہونگے اور ایک کامل صورت میں محشور ہونگے، اسی لیے کوئی مشکل بھی باقی نہیں رہے گی (دقت کریں اور مزید وضاحت کیلئے کتاب ''معاد وجہان پس از مرگ'' کی طرف رجوع فرمائیں)۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) معاد جسمانی سے کیا مراد ہے؟

۲) معاد جسمانی کے منکر کیا کہتے ہیں؟ اور قرآن انہیں کیسے جواب دیتا ہے؟

۳) معاد جسمانی پر عقلی استدلال کیا ہے؟ ذکر کریں

۴) معاد جسمانی اور قانون عدالت میں کیا ربط ہے؟

۵) ''آکل وماکول'' کے شبہہ سے کیا مراد ہے؟ اسکا کیا جواب ہے؟

دسواں سبق

جنت، جہنم اور اعمال کا مجسم ہونا

بہت سے لوگ اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کے موت کے بعد کا جہان بالکل اسی جہان کی مانند ہے یا اس سے مختلف ہے؟

وہاں کے مزے اور وہاں کی سزائیں مختصر یہ کہ وہاں پر حاکم نظام اور قوانین بالکل اسی جہان کی مانند ہیں؟ تو جواب میں ہم واضح طور پر کہیں گے کہ: ہمارے پاس بہت سے شواہد ہیں جو واضح کر رہے ہیں کہ وہ جہان اس جہان سے بہت سی جہات سے مختلف ہے۔ جو کچھ قیامت کے بارے میں ہم یہاں جانتے ہیں وہ اسکی شبیہ ہے جیسے دور سے کسی کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔

بہتر یہ ہے کہ ہم اسی ''جنین'' کی مثال سے واضح کرتے ہیں کہ: جس قدر ''عالم جنین'' کا اس ''دنیا'' سے فاصلہ ہے اتنا یا اس سے زیادہ اس جہان اور اس جہان کے درمیان فاصلہ ہے۔

وہ بچہ جو عالم جنین میں ہے اگر وہ عقل و شعور کا حامل ہو اور وہ یہ چاہے کہ باہر کی دنیا آسمان، زمین، چاند، سورج، ستارے، پہاڑ جنگل اور دریاؤں کی صحیح تصویر لے تو یہ طے

ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں ایسا نہیں کرسکتا۔

لھذا وہ بچہ جو عالم جنین میں ہے اور ماں کے شکم میں چھوٹے سے جہان کا ایک حصہ ہے اسکے لیے چاند، سورج، دریا، امواج، طوفان، باد، نسیم، پھول اور اس جہان کی خوبصورتیاں بالکل کوئی مفہوم نہیں رکھتیں اسکی لغت کی کتاب صرف چند الفاظ میں ہی مکمل ہو جاتی ہے اور فرض کریں جب بھی ہو سکے کہ اس سے باہر سے بات کی جا سکے تو وہ کبھی بھی باہر والے کی بات کا مفہوم درک نہیں کرسکتا۔

تو اس دنیا کی محدودیت کا اس جہان (موت کے بعد کا جہان) کی وسعت سے فرق اسی قدر یا اس سے بھی زیادہ ہے لھذا ہم کبھی بھی یہ قدرت پیدا نہیں کرسکیں گے کہ اس جہان کی نعمات، عنایات اور بہشت برین سے کما حقہ باخبر ہوں۔

اسی لیے ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

"فیھا ما لا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر"

جنت میں ایسی نعمتیں ہیں کہ جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی دماغ میں یہ خیال آیا ہے!

قرآن مجید نے اسی بات کو ایک اور انداز سے بیان کیا ہے:

"فلا تعلم نفسٌ ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزآء بما کانوا یعلمون" (سورہ سجدہ آیت ۱۷)

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے صلہ میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پردہ غیب میں موجود ہے۔

اس جہان پر حاکم نظام اس جہان سے بہت ہی زیادہ مختلف ہے مثلاً: قیامت کی عدالت میں انسان کے ہاتھ، پاؤں، اسکے جسم کی جلد اور یہانتک کہ وہ زمین جہان اس نے گناہ یا نیکی کی وہ اسکے اعمال پر گواہ قرار پائیں گے:

"الیوم نختم علی افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون"

(سورہ یس، آیت ۶۵)

"آج انکے منہ پر مہر لگا دیں گے اور انکے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور انکے پاؤں جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اس پر گواہی دیں گے!

"و قالوا لجلودھم لم شھدتم علینا قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شیء" (سورہ فصلت آیت ۲۱)

اور وہ اپنے جسموں کی جلد سے کہیں گے کیوں تم ہمارے خلاف گواہی دے رہی ہو وہ کہیں گی وہ پروردگار جس نے ہر موجود کو بولنے کی قوت دی اس نے ہمیں (بھی) بولنے کی قوت دی ہے (تاکہ حقایق بیان کریں)۔

کسی زمانہ میں اس قسم کی چیزوں کا تصور بہت مشکل تھا لیکن آج علم و سائنس کی ترقی کے باعث جب ہم مختلف مناظر اور آوازوں کے حاصل (catch) کرنے کی بہت سی مثالوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ چیز بھی باعث حیرت نہیں رہتی۔

بہر حال اگرچہ ہم اس جہان کی نعمات کے بارے میں دور سے نظر آنے والی شبیہ کی مانند جتنا بھی علم رکھتے ہوں اسکی وسعت، اہمیت اور اسکی خصوصیات کو تفصیلاً نہیں جان سکتے لیکن ہم اس قدر جانتے ہیں کہ اس جہان کی نعمتیں اور اسی طرح اس جہان کی سزائیں

دونوں پہلوؤں کی حامل ہیں یعنی جنبہ جسمانی اور جنبہ روحانی، کیونکہ جب معاد میں دونوں پہلو ہیں تو اسکی جزا و سزا میں بھی دونوں جہتیں ہونی چاہیں۔ جسطرح کہ پروردگار مادی اور جسمانی نعمات کے بارے میں فرما رہا ہے:

"و بشر الذین آمنوا و عملوا الصحالحات ان لھم جنات تجری من تحتھا الانھار...... و لھم فیھا ازواج مطھرة و ھم فیھا خالدون"

(سورہ بقرہ آیت ۲۵)

"وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیتے رہے انہیں بشارت دیں کہ انکے لیے ایسے (جنت کے) باغات ہیں کہ جنکے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں ...... اور انکے لیے پاکیزہ بیویاں ہیں اور وہ وہاں ہمیشہ کیلئے رہیں گے۔

اسی طرح معنوی نعمات کے بارے بھی فرما رہا ہے: و رضوان من اللہ اکبر......" اللہ تعالی کی خوشنودی اور رضایت جو کہ جنتیوں کے شامل حال ہوگی وہ ان تمام نعمتوں سے برتر اور بڑھ کر ہوگی!" (سورہ توبہ، آیت ۷۲)

ہاں جب جنتی لوگ یہ محسوس کریں گے کہ پروردگار ان سے راضی ہے اور انکے اعمال کو اللہ تعالی نے قبول کرلیا ہے تو انہیں ایسی خوشی اور لذت محسوس ہوگی کہ جسکا دنیا کی کسی چیز سے مقایسہ نہیں کیا جاسکتا۔

جہنمیوں پر آگ اور دوسرے جسمانی عذابوں کے علاوہ خود پروردگار کا غضب اور اسکی ناراضگی ہر شکنجے سے بدتر ثابت ہوگی۔

اعمال کا مجسم ہونا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روز قیامت ہمارے اعمال زندہ ہوجائیں گے اور یہ مختلف صورتوں میں ہمارے ساتھ ہونگے ، جزاوسزا کا ایک اہم ترین حصہ یہی اعمال کا مجسم ہونا ہے۔

ظلم وجور ایک سیاہ وتاریک بادل کی شکل میں ہمیں ہر طرف سے گھیرلے گا جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک حدیث میں یوں آیا ہے:

" الظلم هو الظلمات یوم القیامة " (سورۂ نساء آیت ۱۰)

ظلم روز قیامت کی تاریکیاں ہیں۔

یتیموں کا ناجائز طریقے سے کھایا ہوا مال آگ کے شعلوں کی صورت میں ہمیں گھیر لے گا اور ایمان نور وروشنی کی صورت میں ہمارے اردگرد پھیلا ہوا ہوگا (سورہ حدید آیت ۱۲)

سودخور جو کہ اپنے اس ذلیل وپلید عمل سے معاشرے کے اقتصادی توازن کو تباہ وبرباد کردیتے ہیں وہ تشنج کے ایسے مریض کی مانند ہونگے جو اٹھتے وقت اپنا توازن قائم کرنے پر قادر نہیں ہوتا کبھی زمین پر گرجاتا ہے اور کبھی اٹھ پڑتا ہے۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۷)

وہ مال جسے ذخیرہ اندوز اور کنجوس مالدار لوگوں نے جمع کیا تھا اور اس میں سے ضروریات سے محروم لوگوں کو انکا حق نہیں دیا تھا وہ بھاری طوق کی صورت میں انکی گردن میں اس انداز سے لٹکایا جائیگا کہ وہ ہلنے جلنے پر بھی قادر نہ ہونگے ۔ (سورہ آل عمران آیت ۱۸۰)

اسی طرح تمام اعمال عمل کی مناسبت سے مختلف صورتوں میں مجسم ہونگے۔

ہم جانتے ہیں آج علم وسائنس یہ کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی کیونکہ

(چیزوں کے اصلی عناصر) مادہ اور انرجی ہمیشہ سے شکل وصورت کو تبدیل کررہے ہیں ہمارے افعال واعمال بھی اس قانون جہان سے خارج نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ باقی ہیں اگرچہ بعد میں انکی شکل تبدیل ہوجائیگی قرآن مجید قیامت کے بارے میں ایک مختصر مگر لرزادینے والی عبارت میں یوں فرمارہا ہے:

" ووجدوا ما عملوا حاضراً"

لوگ اپنے اعمال کو وہاں موجود پائیں گے (سورہ کہف آیت ۴۹)

کیونکہ حقیقت مین انسان جو کچھ ہوتا ہے اپنے اعمال کے ذریعے ہوتا ہے لھذا پروردگار اسی آیہ کے ذیل میں بلافاصلہ فرماتا ہے: و لا یظلم ربک احدا: ''تمھارا پروردگار کسی پر ظلم وستم نہیں کرتا''۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر روز قیامت کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ

"یومئذ یصدر الناس اشتاتاً لیروا اعمالھم"

(سورہ زلزال آیت ۶)

''اس روز لوگ گروہ گروہ کی شکل میں (اپنی قبروں) سے نکلیں گے تاکہ انہیں انکے عمال دکھائے جائیں''

"فمن یعمل مثقال ذرة خیراً یره و من یعمل مثقال ذرة شراً یره "

''جس نے (بھی) ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا'' غور کریں کہ کہا جارہا ہے کہ وہ خود اعمال کو دیکھیں گے۔

اس حقیقت پر توجہ ہونی چاہیے کہ ہمارا ہر چھوٹا، بڑا، اچھا اور برا عمل اس جہان میں باقی اور محفوظ رہے گا اور ختم نہیں ہوگا اور روز قیامت ہمارے ساتھ رہے گا اور یہ چیز ہو سکتا ہے سب کیلئے خطرے کی گھنٹی ہوتا کہ سب برائیوں کے مد مقابل محتاط اور محکم رہیں اور نیکوں کو چاہنے والے اور ان پر ثابت قدم رہنے والے بن جائیں۔

ایک دانشور لکھتا ہے: آج ممکن ہے دو ہزار سال قبل کے مصری کمہاروں کی آوازوں کی لہریں یوں حاصل کر (catch) لی جائیں کہ وہ سننے کے قابل ہوں، کیونکہ مصری عجائب گھروں میں دو ہزار سال پرانے ایسے کوزے بھی موجود ہیں کہ جنہیں مخصوص چکروں اور ہاتھوں کے ذریعے بناتے وقت بنانے والوں کی آوازوں کی لہریں ان کوزوں کے جسموں پر نقش ہوگئی تھیں کہ آج ممکن ہو چکا ہے کہ ان لہروں کو دوبارہ نئے سرے سے یوں زندہ کیا جائے کہ ہم اپنے کانوں سے انہیں سن سکیں!! بہر حال قرآن مجید میں مذکور مسئلہ معاد اور نیکوکاروں کی ہمیشہ کی جزا اور بدکاروں کی ہمیشہ کی سزا کے حوالے سے جو بہت سے سوال مطرح ہوتے ہیں تو انکا اسی بحث ”اعمال کا مجسم ہونا“ اور یہ کہ ہر عمل چاہے وہ اچھا ہو یا برا ہماری روح و جان پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اثر ہمیشہ ہمارے ساتھ باقی رہتا ہے“ کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے۔

سوچیے اور جواب دیجیے۔

۱) کیا انسان کی روز قیامت کی زندگی ہر جہت سے دنیا کی زندگی کے مشابہ ہے؟

۲) کیا ہم قیامت کی سزاؤں اور جزاؤں کو بالکل اسی طرح اس دنیا میں بھی درک کر سکتے ہیں؟

۳) آیا جنتی نعمات اور جہنمی عذاب صرف جسمانی حوالے سے ہیں؟

۴) اعمال کے مجسم ہونے سے کیا مراد ہے؟ اور قرآن اسے کیسے بیان کر رہا ہے؟

۵) اعمال کے مجسم ہونے کا عقیدہ بحث معاد کی کونسی مشکلات کو حل کر رہا ہے؟

یا صاحب الزمانؑ ادرکنی

خدمتگارانِ مکتبِ اہلبیت (ع)

سید حسن علی نقوی

حسّان ضیاء خان

سعد شمیم

حافظ محمد علی جعفری

﴿التماس سورۃ الفاتحہ﴾

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوذر شہرت بلگرامی ابن سید رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ امّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان